AFKAR



افکار

-/9/-

نمبر

سرخیاں

جلد ۷
شمارہ ۷
ستمبر ۱۹۴۸ء

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبالؔ)

ماہنامہ

افکار

بھوپال

زرِ سالانہ چھ ۶ روپے
فی پرچہ نو آنے

:نگراں:
حکیم سید قمر الحسن

:ادارہ:
رشدی۔ صہبا

افکار

کی فائلیں تیار ہیں

ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت ہے کہ افکار کی چند فائلیں قارئین کرام کی مسلسل فرمائشوں پر ہم نے تیار کرالی ہیں پچھلے چند سالوں میں اردو زبان، ادب نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اور افکار نے ہندستان کے چوٹی کے فنکاروں کے تعاون سے جو خدمات انجام دی ہیں اردو داں طبقہ ان سے بخوبی واقف ہے۔

پہلی فرصت میں آرڈر روانہ فرمائیے۔ بہت تھوڑی فائلیں ہم بکوشش تیار کرا سکے ہیں۔

۱۔ فائل سنہ ۴۶ء — ستمبر سنہ ۴۶ء لغایتہ فروری سنہ ۴۷ء مجلد قیمت مع محصول ڈاک چار روپیہ

۲۔ فائل سنہ ۴۷ء — مارچ سنہ ۴۷ء لغایتہ فروری سنہ ۴۸ء مجلد قیمت مع محصول ڈاک چھ روپیہ

نوٹ:— قیمت ہر صورت میں پیشگی ارسال فرمائیں۔ وی پی بھیجنے سے مجبوری ہے

چند فنکار

قاضی نذر الاسلام - پروفیسر نواب علی - پروفیسر شور - احتشام حسین - احمد ندیم قاسمی - قتیل شفائی - جاں نثار اختر - مکین احسن کلیم - میرا جی - ابراہیم جلیس - کمال احمد صدیقی - اختر ہوشیارپوری - غلام ربانی تاباں - مقبول حسین احمد پوری - اختر الایمان - ڈاکٹر شہرت - فکر تونسوی - ظہیر کاشمیری - قدوس صہبائی - پریم ناتھ پردیسی - ناہید عالم - شوکت صدیقی - ادا بدایونی - انتصار رضوی - اطہر پرویز - محمد عظیم - احسن علیخاں - صدیقہ بیگم - مرزا ادیب - نیاز حیدر - ظ انصاری - مجروح سلطانپوری - اصغر شعری - سلام مچھلی شہری - اشتیاق عارف - ڈاکٹر حبیب الرحمن - قمر جمالی - انور عظیم اور دوسرے۔

منیجر "افکار" بھوپال

اشاریہ

ہندوستان کے گورنر جنرل مسٹر سی راجگوپال اچاریہ ایک حقیقت پسند اور بے تعصب مدبر ہیں۔ ان کی نظر دور تک کے حالات کا جائزہ لیتی ہے اور وہ اپنے مشاہدات کی روشنی میں حال کے آئینہ میں مستقبل کا چہرہ دیکھ لیتے ہیں۔ لسانی تنازعہ کے بارے میں آپ کا نظریہ نہایت ہی فراخ حوصلگی اور دور اندیشی پر مبنی ہے اور اس سلسلہ میں عصری رجحانات کا انھیں پوری طرح احساس ہے چنانچہ آپ نے میسور میں ہندی پرچار سبھا کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے ہندوستانی کی تعلیم پر زور دیا اور کہا ——

"اگر آپ کو اپنے بچوں سے محبت ہے اور اُن کے مستقبل کا خیال ہے تو انھیں ہندوستانی پڑھائیے ——

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ ہمیں ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے ہمیں ہندوستانی سے بخوبی واقف ہونا چاہئے، کیونکہ یہ ملک کی مقبول ترین زبان ہے ——"

حقیقت یہ ہے کہ راجہ جی نے نہایت بیباکی اور صفائی سے اس کا اظہار کر دیا ہے کہ ہندوستانی ہمارے ملک کی "راج بھاشا" ہے اور اس کے اب کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم سب مل کر اس قومی کیریکٹر کی زبان کو پورے ملک میں رائج کرنے میں سرگرمی دکھائیں۔ ہندوستانی دراصل اُردو اور ہندی کی ایک آسان صورت ہے اور اپنی مشترکہ حیثیت کی وجہ سے مشترکہ کلچر اور تہذیب کی حامل ہے —— لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض کانگریسی قائدین کھلم کھلا سنسکرت کو عوام پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ صرف وہی زبان مقبول عام ہوتی ہے جو عام لوگوں میں جذب ہو سکے محض سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مشترکہ ثقافت سے انحراف ایک مجرمانہ ذہنیت ہی کا مظہر ہو سکتا ہے۔ مسٹر ٹنڈن اس موضوع پر آجکل اندھا دھند بیانات دیکر فضا کو خراب کر رہے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں جبلپور کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر مسلمان انڈین یونین میں رہنا چاہتے ہیں جو ایک غیر مذہبی اسٹیٹ ہے تو انھیں ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے اور ناگری کو قومی رسم الخط کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑیگا۔ مسٹر ٹنڈن دل کے بہلانے کو جو چاہیں کہہ لیں انھیں اس بات کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر لینا چاہئے کہ ہندوستان کے گورنر جنرل اور وزیر اعظم ان کے نظریات سے متفق نہیں ہو سکتے وہ گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کر چکے ہیں اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود اپنے مشن کو پورا کریں گے۔ پنڈت نہرو نے مدراس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں زبان اور رسم الخط کے بارے میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے اندر گاندھی جی کے خیالات کی تائید کروں گا۔ کاش مسٹر ٹنڈن اور اُن جیسے دیگر جذباتی کانگریسی اپنے زہریلے بیانات سے ملک کے سچے مفاد کو نقصان پہنچانے سے احتراز کریں۔

آج ہمارے آزاد ملک میں بیروزگاری عام ہے انفلیشن زوروں پر ہے اور اقتصادی بحران بڑھتا جا رہا ہے اس کا بنیادی سبب سرمایہ دارانہ نظام کی مفلوج حکمت عملی ہے، بدیع مشہدی نے اپنے مضمون میں نہایت مدلل طور پر اس موضوع پر بحث کی ہے اور اس کا مناسب حل پیش کیا ہے —— انڈین یونین میں اُردو کا مستقبل کس قدر تاریک ہے اور یہاں اُردو کے کام کرنیوالوں کے حوصلے کس طرح پست ہو رہے ہیں انیس الرحمٰن نے اس پر فاضلانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ کاش محبان اُردو اب بھی جاگ سکیں —— ریڈیائی ڈرامے، آل احمد سرور کا ایک مختصر سا تبصرہ ہے جس میں آپ نے ریڈیائی ڈراموں کا جائزہ لیا ہے —— میراجی کو آپ شاعر ہی کی حیثیت سے جانتے ہونگے لیکن "منظر نامہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار بھی ہیں تحت الشعوری کیفیات کا انھوں نے جس اچھوتے طریقہ سے تجزیہ کیا ہے وہ لائق داد ہے —— صدیقہ بیگم گلدان کے پھول پیش کر رہی ہیں جو ان کا مؤثر اور دلچسپ افسانہ ہے —— زکی انور۔ یہ فنکار برابر ترقی کر رہا ہے اور اس کی کہانیاں کافی مقبول ہو رہی ہیں، طوفان سے پہلے اس کا معیاری افسانہ ہے —— اور آپ جگنے میں آپ کے تمام محبوب اُدبا

نغمہ دہ ترنگ، نئی اردو شاعری کی بہترین تخلیقات ہیں — جیوتی پرشاد — (۱۶۱۳)

مدّوجزر

۱۵ اگست

ہندستان اور پاکستان کو آزادی لے ایک سال بیت گیا۔ دونوں حکومتوں نے ۱۵ اگست کو یوم آزادی بڑی جوش و خروش سے منایا۔ ہندستان میں پنڈت نہرو نے بحیثیت وزیر اعظم اور پاکستان میں قائد اعظم نے بحیثیت گورنر جنرل ملک کو حوصلہ افزا پیغامات سے سرفراز فرمایا۔ حکومتوں کے زیر اہتمام یوم آزادی پر جھنڈے لہرائے گئے، سلامیاں دی گئیں، مشاعرے اور کوی سمیلن منعقد کئے گئے، دعوتیں ہوئیں اور وہ سب کچھ کیا گیا جو آزاد ممالک میں کیا جانا چاہئے ——— وزیر ہند نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا ———

"آج آزاد ہندستان کی عمر ایک سال ہو چکی ہے۔ اپنی آزادی کے اس ابتدائی دور میں ہمیں جن آزمائشوں اور امتحانات سے گذرنا پڑا ہے اُن کو وہ کامیاب اور سربلند نکل آیا ہے ——" آگے چل کر آپ نے اعتراف کیا —— "ہمیں اپنی غلطیوں اور اپنی ناکامیوں کو بھی نہ بھولنا چاہئے کیونکہ ہمیں بہت سی غلطیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ——" گورنر جنرل پاکستان نے اپنے پیغام میں ارشاد فرمایا ——— "آج ہم آزادی کی پہلی سالگرہ منا رہے ہیں۔ ہم نے سال بھر تک جرأت، عزم و استقلال اور تخلیقی قوت سے کام لیا اور ہم نے جو کامیابی حاصل کی وہ تعجب خیز ہے۔ ہم نے دشمن کے حملوں سے خود کو محفوظ رکھا اور اندرونی طور پر صحیح تعمیری کام کیا ———"

ان تقاریر کی اصطلاحی حیثیت سے کون ہے جو انکار کر سکے۔ ہندستان اور پاکستان کے ارباب حکومت یوم آزادی پر اس سے زیادہ پُر مغز اور معنی آفریں حقائق بھلا پیش بھی کیا کر سکتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان دونوں ممالک کے عوام نے یوم آزادی اور یوم آزادی کی کھوکھلی تزئین و آسائش سے ہٹ کر صرف اپنے متعلق سوچا۔ ارباب حکومت کی سوچ اور عوام کی سوچ میں سدا سے اختلاف رہا ہے اور یہ تصور محض بیکار ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں قومی حکومت ہے، جمہوری نظام ہے اور عوام کے نمائندے برسرِ اقتدار ہیں۔ اب اسے یوں سوچئے کہ آزادی کے اس ایک سال میں جنتا کی بھوک کا کیا علاج ہوا؟ ننگوں کی تن پوشی کے کیا انتظامات کئے گئے؟ افلاس اور بیماری سے کتنوں نے چھٹکارا پایا آزادئ تحریر و تقریر سے کتنے بہرہ یاب ہوئے؟ عوامی تحریکات پر پابندیاں تو عاید نہیں ہوئیں؟ اور یہ سوچنے کے بعد پھر یہ سوچئے کہ آزادی کے اس ایک سال میں کتنے عوامی لیڈر جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ کتنے شہروں میں لاٹھی چارج سے عوام کی خدمت کی گئی۔ کتنے مقامات پر اشک آور گیس کا آزادانہ استعمال ہوا۔ کتنی جان لاشیں بے گور و کفن سڑتی رہیں۔ کتنوں نے مسلسل فاقوں سے دم توڑ دیا اور کتنے گھر سے بے گھر ہو کر آزادی کی نعمتوں سے مالامال ہوئے ———؟

اس یوم آزادی پر دونوں حکومتوں کے ارباب بست و کشاد کی بے پناہ خوشیوں پر ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن جب عوام گرانی، افلاس، بھوک، افراطِ زر، قیود اور پابندیوں کے لامتناہی سلسلوں اور سخت شدائد سے تنگ آ کر چیخ اُٹھے ہوں۔ اور جب ان کی چیخیں کراہوں میں تبدیل ہو چکی ہوں تو ہم پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا یہی حقیقی آزادی ہے۔ یہی آزادی کے وہ پھل ہیں جس کی شیرینی کے حسین و دلفریب خواب آزادی سے پہلے ہمیں دکھائے جاتے تھے۔ یہی آزادی وہ آزادی ہے جسے ایک سامراج نے دوسرے سامراج کو تحفتاً پیش کیا ہے۔ یقیناً ——— ہم اب خواب دیکھ رہے ہیں نہ خوابوں کی بستی میں لوٹنا چاہتے ہیں — ہمیں زندہ حقائق سے واسطہ ہے —— واسطہ رکھنا ہوگا —— جب تک دونوں حکومتیں عوام کے صحیح نمائندوں کو صحیح مقام نہ دیں گی جمہوری نظام قائم ہو سکے گا، نہ آزادی کی نعمتوں سے عوام مستفید ہو سکیں گے ——— ہم دونوں حکومتوں کے اربابِ حل و عقد کے سامنے یہ تلخ حقائق رکھ کر اُن کے جمہوری اقدامات کے منتظر ہیں۔

(ادارہ)

سنگ و خشت

دیدہ رشس

ہندوستانی اکاڈمی کو جو اب تک اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کی خدمت کر رہی تھی، حکومت یو، پی کے حکم سے "ہندی اکاڈمی" میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور حیات اللہ انصاری، آل احمد سرور اور رشید احمد صدیقی کی اس رائے کو کوئی وقعت نہیں دی گئی کہ اکاڈمی کو دونوں زبانوں میں حسبِ معمول اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔ جس قسم کی ہندی کی حمایت کی جائیگی اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ملاحظہ فرمایئے جو یو، پی گزٹ سے لیا گیا ہے:—

"ایک پرتگیا پتر جو شریمتی گورنر مہودیا سنگیت پرانت جو اس کے پشچات شریمتی گورنر مہودیا لکھی جائیں گی پہلا پکش اور ایک سنستھا رکن الدین مُسلم جاٹ اسکول سنستھا استھان آسارہ ضلع میرٹھ رکن الدین جس کی رجسٹری سوسائیٹیوں کی رجسٹری ایکٹ سنکھیا ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ء جو اس کے پشچات سنستھا لکھی جائیگی کے اودھین ہوئی ہے۔ دوسرا پکش مدھیہ لکھا گیا"

ـــــ دیکھا آپ نے لسانی فسطائیت کا کتنا دلکش نمونہ ہے ـــــ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

:.ـــ :.ـــ :.ـــ :.ـــ :.

کیشورلال مشروِالا "ہریجن" میں رقمطراز ہیں کہ "ہند اور پاکستان دو جڑواں بھائی ہیں ـــــ یہ دونوں بچے سال بھر سے بیمار، کمزور، دُکھی اور شرارتی رہے ہیں کہ کئی لوگوں کے دل اُن سے ٹوٹ گئے ہیں" ـــــ جی ہاں پھر بھی یہ "شرارتی بچے" اپنی سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں اور اپنی بیماریوں کا جو ناسور بنتی جا رہی ہیں کچھ علاج نہیں کر رہے۔

:.ـــ :.ـــ :.ـــ :.ـــ :.

اُردو کے مصنف اور صحافی ہمیشہ مفلس اور قلاش رہتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو قرض دام یا چندہ سے تجہیز و تکفین عمل میں آتی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے مرہٹی یا ہندی کا ادیب بینک میں کافی روپیہ اور بیمہ کی رقم چھوڑ کر جاتا ہے ـــــ اختر انصاری (علیگ) نے مصنف کی بیچارگی اور کسمپرسی کا جو نقشہ کھینچا ہے آپ بھی دیکھ لیجئے:—

مجھے خدا نے بنایا مصنف و فنکار
جواں نگار ادیب اور طرب فشاں شاعر
اگر کتابوں کی دنیا ہی تھی مری تقدیر
تو کیوں نہ مجھ کو بنایا کتابوں کا ناشر؟
جو یہ نہیں تو بنا تا کرم سے اپنے مجھے
رسائل و کتب و کاغذات کا تاجر
اگر میں اس کے بھی قابل نہ تھا تو پھر مجھ کو
بنایا ہوتا کتابت کے فن کا ہی ماہر
یہ کیا کیا کہ مصنف بنا دیا مجھ کو!
بنا دیا کہ نہ جانے مٹا دیا مجھ کو!!

اقبالؔ کی زبان میں کہہ لیجئے:—

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے!

:.ـــ :.ـــ :.ـــ :.ـــ :.

ہندوستانی تھیٹر ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری نرنجن سین اور جوائنٹ سکریٹری خواجہ احمد عباس نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے ـــــ کلچر اور تہذیب کے چاہنے والے مصنف، ادیب اور فنکار ۱۵ اگست سنہ ۴۷ء کو سمجھتے تھے کہ اب آزادی کا دور شروع ہوا ہے لیکن اس کے بعد واقعات نے ظاہر کر دیا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اب ہم فنکاروں، ادیبوں اور لکھنے والوں کو ان رجعت پرستوں کا نشانہ بننا پڑیگا جو حکومت میں گھسے ہوئے ہیں اور اونچی جگہ سنبھالے ہوئے ہیں ـــــ "آزادی کس چڑیا کا نام ہے" ـــــ؟

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

رباعیات

سینے میں ہے اک ناوکِ غم پیوستہ
تاریک ہے منزل کا ابھی تک رستہ
بہتا ہے جو انساں کا لہو بہنے دے
ہر خون کی بوند ہے شرارِ جستہ

فطرت کی ہر اک شے ہے بحسنِ مطبوع
ہر ذرۂ عالم ہے بلند و مرفوع
انساں کے مطالعے کی خاطر لیکن
انساں سے نہیں کوئی بھی بہتر موضوع

یہ عشق کرشمے سے دکھاتا ہے مجھے
ہر حال میں دیوانہ بناتا ہے مجھے
یا بے ترے چین مجھ کو آتا ہی نہ تھا
یا تو جو نہ ہو تو چین آتا ہے مجھے

ہر لمحۂ حاضر ہے طرب کا ضامن
کھلتی ہوئی راتیں ہیں تو ہنستے ہوئے دن
ہر عشرت ممکن ہے بجھائے ہوئے دل
ماضی سے محبت نہیں جاتی لیکن

گلشن کا لٹا سہاگ کتنی جلدی
چہرے پہ خزاں کی پھر گئی ہے ہلدی
بھرنے بھی نہ پائی تھی ابھی پہلی گود
پھولوں کو لٹے بہار کیسی چلدی

عقلوں میں پڑے ہوئے ہیں پھندے کتنے
ذہنوں میں خیالات ہیں گندے کتنے
کیا جانے ابھی وقت کے ہاتھوں اختر
انساں پہ کئے جائیں گے رندے کتنے

جاں نثار اختر

پیرِ مغرب سے

مرے عزیز، مرے محترم مرے آقا　　مجھے نہ دیکھ حقارت بھری نگاہوں سے
یہ میرے نام سے وابستہ ذلتِ پیہم　　ملی ہے بھیک میں لندن کی بارگاہوں سے

⁂ ⁂ ⁂

میں ایک شاعرِ مزدور میرے نغموں نے　　بجھے بجھے سے دماغوں میں چاندنی بھر دی
خیال و فکر کی محراب میں چراغ جلائے　　ہر ایک لب میں بغاوت کی راگنی بھر دی

⁂ ⁂ ⁂

مجاہدانِ دل افگار میرے ہمراہی　　شکستِ خواب کا الزام مجھ پہ دھرتے ہیں
لہو لہان سویرا طلوع ہونے پر　　مرے جنونِ اخوت پہ طنز کرتے ہیں

⁂ ⁂ ⁂

سیاہ رات میں اُجھل ہزار ہاتھوں نے　　سحر نگار اجالوں کو گھونٹ ڈالا ہے
نڈھال سینوں سے انسانیت کا سوزِ دروں　　مرے دیار کی سڑکوں پہ نوچ پھینکا ہے

⁂ ⁂ ⁂

سیاسیات کے شاطر قمار خانوں میں　　بچی کھچی سی شرافت بھی بیچ آئے ہیں
علاجِ درد کی خاطر طبیبِ مغرب کو　　دھڑکتے دل کی حرارت بھی بیچ آئے ہیں

⁂ ⁂ ⁂

مرے عزیز، مرے محترم، مرے آقا　　تری ہوس کو نئی زندگی مبارک ہو
تری نگاہ، ترے دلنواز چہرے کو　　یہ زہر خند، یہ تابندگی مبارک ہو

نشاط شاہدوی

فنکار

گائے جا مغنی گائے جا، گائے جا مغنی گائے جا!

اس کیف کی رقصاں محفل میں، سب کیف ہے تیری ہستی سے
چھاگل سی لہو میں بجتی ہے، دل ناچ رہے ہیں مستی سے
کیوں لحن میں تیرے لرزش ہے، کیوں ہونٹ ترے تھراتے ہیں
یہ دیکھ کہ جب تو گاتا ہے تو چاند ستارے گاتے ہیں
ہر آن سنائے جا نغمے، کچھ اپنی تھکن کا دھیان نہ کر
دُنیا کی تمنا پوری کر، تو آپ کوئی ارمان نہ کر
دُنیا کے دُکھی فنکاروں کو، دینا ہے نئی اک آس تجھے
کیسی ہی لگی ہو بھوک تجھے، کیسی ہی لگی ہو پیاس تجھے

گائے جا مغنی گائے جا، گائے جا مغنی گائے جا!

دل وجد میں ہی جاں رقص میں ہی، خاموش نہ ہونا اے مُطرب
بیخود ہو زمانہ، تو لیکن بے ہوش نہ ہونا اے مُطرب
آنکھوں میں جو آنسو آتے ہیں، مَدھ جان کے اُن کو پیتا جا
ہر تان پہ دم کو توڑے جا، مر مر کے مُسَلسل جیتا جا
ہونٹوں کو نہ کرنا بند ابھی، ہاتھوں سے نہ رکھنا ساز ابھی
تو سانس ابھی تک لیتا ہی زندہ ہے تری آواز ابھی
جو پھانس گڑی ہے دل میں ترے، وہ پھانس گڑی ہی رہنے دے
جو لاش پڑی ہی گھر میں ترے، وہ لاش پڑی ہی رہنے دے

گائے جا مغنی گائے جا، گائے جا مغنی گائے جا!

شمیم کرہانی

ہرجائی

سلگتے لمحوں کے زرد شعلے فسردہ راہوں کو چومتے ہیں
اداس پرچھائیوں کا دامن فضاؤں میں سرسرا رہا ہے
شکستہ دل وقت کے لبوں پر وہی کہانی سسک رہی ہے
غم پیر میخانہ ساغروں میں ابد کی تلخی ملا رہا ہے

ابھی ابھی ذہن کے دریچوں سے چند یادوں نے مسکرا کر
ازل کے مہکے ہوئے شبستاں کے بھولے بسرے فسانے چھیڑے
وہ رات جب تیرے سرخ ہونٹوں نے میری تنہائیوں کے غم میں
جوان جسموں کے طویل راتوں کے غیرفانی ترانے چھیڑے

میں سوچتا ہوں کہ آج بھی تیری ہر ادا تیری ہر نظر میں
گذشتہ صدیوں کے شوخ تیور شباب بن کر دمکتے ہونگے
ہزاروں چنگیز و نادر اپنے لٹے ہوئے تخت و تاج لے کر
تری حسین و جمیل سیجوں پہ اشک بن کر چھلکتے ہوں گے

یہ لحظہ لحظہ بدلتے رنگوں کے دل لبھاتے ہوئے شرارے
نہ جانے کتنے عجیب خاکوں عجیب نقشوں میں ڈھل چکے ہیں
یہ پُرفسوں بیکنار نگیاں، یہ نیم وا در، یہ شوخ پردے
نہ جانے اس دائرے میں کتنے مہیب طوفاں مچل چکے ہیں

تری جوانی حدودِ کونین پر قناعت نہ کر سکے گی
تری نگاہوں کی ساحری پر وفا کا جادو نہ چل سکے گا
ترے تلوّن پہ انحصارِ نظامِ عالم ہے۔ جانتا ہوں
سیاہ و سرخ و سفید شعلوں سے تیرا آنچل نہ جل سکے گا

نور بجنوری

اسپتال میں

یہ ایک بار درد اٹھا ——————
پھر ایک بار میری چیخ سے فضائے اسپتال گونجنے لگی
بدن تمام آگ کا دہکتا شعلہ بن گیا
دلِ حزیں کی دھڑکنوں میں انتشار سا بپا ہوا
ہزار ڈھونڈھنے پہ بھی پتہ نہیں ہے نبض کا
کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے ساری نبضِ کائنات ڈوبنے لگی!

یہ ڈاکٹر —— یہ زندگی کی کشتیوں کے ناخدا
نئے انوکھے جگمگاتے آلے ہاتھ میں لئے مرے قریب بار بار آ کے دیکھتے ہیں کیا؟
یہ کس لئے ہے ان کی انگلیوں کی ضرب بے پناہ میرے سینۂ نحیف پر —— ؟
برس رہے ہیں شام سے تسلیوں، تشفیوں کے مجھ پہ نرم پھول کیوں —؟
فضائے اسپتال آج کس قدر اداس ہے
ہواؤں پر، فضاؤں پر خموشیوں کی ساحرہ نے بُن دیئے ہیں جال سے
کوئی کراہ، کوئی چیخ، کوئی آہ اس سکوتِ شام کو جھنجھوڑتی نہیں!
اف آج شام جیسے اسپتال میں مرے سوا کوئی نہیں!!
مرے سوا کوئی نہیں جو ان خموشیوں، اداسیوں سے جنگ کر سکے —— ؟

پھر ایک بار درد کی تڑپ سے موت کے مہیب خد و خال ابھر گئے
سنہرا چاند زندگی کے درد سے گریز کر کے ڈوبنے لگا
ستارے آپ اپنے نور کے کفن میں منہ چھپا کے سو گئے
میں سوچنے لگا ——
میں سوچنے لگا کہ آج رات جیسے میری زندگی کی آخری ہی رات ہے
یہ سوچتے ہی میرے ذہن پر ہزار بدلیاں امنڈ پڑیں
تفکرات کے نئے نئے دریچے کھل گئے
مرا نحیف و ناتواں خیال موت کی اندھیری وادیوں میں رینگنے لگا ——!

عجیب سی فضا تھی جس میں سانس لے رہی تھی زندگی
جہاں محبتوں کی داستاں، خمارِ غم، جنوں کی گرمیاں نہ تھیں
نہ قہقہے، نہ چہچہے، نہ بزمِ شعر و بزمِ ناؤ نوش تھی
ہر اک طرف محیط تھا سکوتِ مرگ —— ہر طرف اداسیاں (مہیب اور جاوداں)
نجانے پھر کہاں سے سامنے ابھر کے ایک سایہ آ گیا
بہت ہی لمبا ہولناک —— سر سے پاؤں تک ڈراؤنا
مری طرف بڑھے ہوئے سیاہ اور طویل ہاتھ
خدا کہیں یہ مجھ کو گود میں اٹھا نہ لیں ——!!
میں خوف اور ہراس سے لرز کے اپنے نرم سے لحاف میں دبک گیا

پھر ایک بار دل کی دھڑکنوں میں بجلیاں سی کوندنے لگیں
مگر وہ سرد اور مہیب ہاتھ میرے اور پاس آ گئے
مجھے اُٹھا کے اپنے سینے سے لگا لیا
دہکتے جسم کی حرارتیں برودتوں میں ڈھل گئیں ——— میں برف ہو کے رہ گیا
میں ایک مشتِ خاک کے علاوہ کچھ رہا نہ تھا ———!!
ہر ایک سمت شور و نالہ کی صدائیں گونجنے لگیں
کفن کی سرسراہٹیں مرے قریب آ گئیں
جنازہ میرا شہر سے پرے نجانے کس طرف کو چل دیا
اک ایسی راہ جس پہ آج تک میں زندگی میں بھول کر گیا نہ تھا
جنازہ کی نماز اور درود و فاتحہ کی رسم ادا ہوئی
وہ مولوی کہ آج تک جسے حقیر جانتا رہا ——— وہ پیش امام تھا!!
اور اس کے بعد بے شمار ہاتھوں نے مجھے ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دیا ———!!

نہ جانے کتنی دیر تک میں قبر میں نئی جگہ سمجھ کے چپ پڑا رہا
مگر اداسیوں، خموشیوں، اندھیریوں کا پھیلتا سمندر اور پھیلتا گیا
حیات اور ممات بلکہ ساری کائنات اس محیطِ بیکراں میں کھو گئی
میں سوچنے لگا ———
ہری بھری، لہکتی، مسکراتی، جگمگاتی، گنگناتی کائنات
سوائے ایک ہجرتِ اشکِ خوں کے آج کچھ نہیں
فریب تھی یہ زندگیٔ مستعار ایک فریب تھی
بے حقیقتوں کا نام دے کے مطمئن رہے کہ جیسے موت اک فریب ہو
مگر حقیقتوں کی تلخیاں بروئے کار آ گئیں ———!
عدم کی سرد گود میں حیاتِ مستعار کو سلا گئیں ———!!

میں قبر کی اداسیوں سے تنگ آ کے سوچنے لگا
کہ میرے بعد اس جہانِ رنگ و بو میں کیا ہوا ———
مری شفیق ماں کے سر پہ آسمان پھٹ پڑا
مرا عزیز باپ بجلیوں کی زد میں آ گیا
مری بہن نے روتے روتے اپنے ہوش کھو دیئے
میں ان کی آرزو تھا، آسرا تھا ——— ان کی ہر امید میرے دم سے تھی
ہزاروں جگمگاتے، مسکراتے خواب میری مرگِ ناگہاں سے ناامیدیوں میں ڈھل گئے
صدائے ماتم اور شورِ گریہ سے زمین و آسمان دہل گئے
وہ گھر جو پرسکون تھا، جہاں خوشی تھی، شادمانیوں کا دور تھا ——— (وہ حشر خیز غمکدہ تھا)
وہ نور فام، لالہ فام، مہ جبین و گلعذار لڑکیاں
جو اک امیدِ خام پر، مری نگاہِ التفات کی
لٹا رہی تھیں اپنی نوجوان مسکراہٹوں کی دلربائیاں
ترستی آرزوؤں کے جنازے اپنی آنکھوں میں لئے ہوئے
وہ آج سب اداس تھیں ———
میں سوچنے لگا کہ میری مرگِ نوجواں سے سب کے چہرے گردِ غم سے زرد ہیں
یہ غم کا بوجھ ان کی زندگی کی کشتیاں ڈبو نہ دے
یہ ناامیدیوں کا سیلِ بے پناہ اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں

یہ سوچ کر میں رو دیا
مری اداس آنکھیں سیلِ خوں میں ڈوبنے لگیں
مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا
ہر اک طرف فضاؤں میں سکوتِ مرگ تھا رواں دواں ——— !!

مرا مریض ذہن یونہی کروٹیں بدل بدل کے سوچتا رہا
وہ زندگی ——— وہ زندگی جو روٹھ کر چلی گئی تھی اس کو ڈھونڈھتا رہا
بھٹکتے ڈھونڈھتے ہوئے، کسی حسین کائنات کے اُفق کو جا کے چھو لیا
محبتوں کے سبزہ زار و نغمہ زار و لالہ زار و آبشار
گئے دنوں کی یادگار ———
وہ سامنے کے کنج سے ادھر یہ آ رہا ہے کون ——— ؟
ارے یہ تم ہو میری نجمہ ———؟ میری زندگی ——! مری محبتوں کی رازدار !!
تم اس قدر اداس ہو! نہیں نہیں تمھیں مری قسم !! بتاؤ میری جانِ زار
تمھیں یہ آج کیا ہوا ——— ؟
جوانی اور فسردگی! شباب اور اداسیاں ——— !!
تمھیں تو یاد ہوں گے وہ دن جو کٹ گئے تھے سامنے کے دشتِ مرمریں کے پاس چاندنی کے سائے میں
وہ چاندنی خنک خنک، فضائے شعر و نغمہ، مسکراتا چاند اور تم !!
شگوفے، پھول، کرنیں، سائے اور جھیل میں حسین ترین کنول
جوان دل، دھڑکتے سینے، دستِ شوق، تھرتھراتے لب !!
نجانے کتنی رات تک لبِ آب بیٹھے سوچتے رہتے تھے زندگی کے مسئلے
سہاگ رات کی طرح حسین تھی وہ چاندنی کہ جس کی نرم چھاؤں میں کیا تھا ہم نے تم نے ایک عزم!
"سماج کی ہیبت، بے کراں خلیج کو عبور کر کے ایک دوسرے کو پائیں گے"!!
جبینِ تابناک پر تمھاری عزمِ نو کی تھی جھلک
مگر یہ آج تم کو کیا ہوا ——— ؟
کھلے ہوئے سنہرے بال، اداس لب، بجھا سا چہرہ، زرد گال !!
یہ آنکھیں جن کے پیچھے ماہتاب و کہکشاں کے عکس جلوہ ریز تھے
یہ آج سیلِ اشکِ خوں میں جیسے ساری کائنات کو بہا کے بھی نہ لیں گی دم
تمھارے لب تو گنگ ہیں، مگر اداس آنکھیں کہہ رہی ہیں داستاں
"تمھارے بعد ——— !!"
ان آنکھوں کی یہ بات سن کے سارے خواب، سارے رنگ و نور کے محل
اداسیوں سے قہر کی شکست کھا کے جانے کس خلا میں کھو گئے
پھر ایک بار جلتے جلتے آنسوؤں کے چشمے میری آنکھوں سے ابل پڑے
میں بیکسی کا نقشِ لازوال بن گیا ——— !

نجانے کتنی دیر تک خموش میں پڑا رہا
اور اس کے بعد سوچنے لگا
کہ اپنی زندگی میں میں تو اک ادیب تھا
اک ایسا شاعر و ادیب جس کو بعدِ مرگ کوئی پوچھتا نہیں
مری جوان شاعری ——— مرے فسانے میری زندگی کے رازداں
ادب کی شاہراہ پر ——— ہوا میں اڑتی سوکھی پتیوں کا سا بے حقیقت ایک کارواں
کہ جس کی سمت کوئی راہگیر آنکھ اٹھا کے دیکھتا نہیں

یہ راہگیر ــــــــ ناقدینِ فن!
مری جان کاوشوں کو کیوں سراہنے لگے ــــــــ؟
مرے خطوط، میری ڈائری، مری ادھوری ناولیں،
مرے ہزاروں شاہکار، میری زندگی کے رازدار،
ادھوری زندگی کی طرح سب ادھورے رہ گئے!
غبارِ راہ بن کے کھو گئے!!
عدم کی نیند سو گئے!!!

میں سوچتا رہا ــــــــ
تصورات کی حدوں میں ساری زندگی سمٹ کے آگئی
گناہ کی سیاہیاں،
گناہ! جن کو پاک اور حسین کہہ کے عقل کو فریب دے لیا
تمام عمر آرزوئے حسن اور داستانِ عشق میں گذر گئی
نظامِ وقت کے خلاف سازشوں پہ سازشیں
خدا اور اس کے دین سے بغاوتوں کے ولولے
غرض تمام زندگی ــــــــ
وہ زندگی جسے امانتِ خدا کہیں
فضول رائیگاں گئی ــــــــ!!

میں رنگ و بوئے زندگی کی سوچ میں الجھ کے، تھک کے مضمحل سا ہو گیا
پھر ایک بار اپنی قبر کی حدوں میں آگیا
نگاہیں میری جانے کس خلا میں گھورتی رہیں
نگاہیں ــــ جو تلاش و جستجوئے حسن میں تمام عمر دربدر بھٹکتی گھومتی رہیں
جو شوخ مہ جبینوں کو، اداس رخ حسینوں کے لبوں کو عارضوں کو چومتی رہیں
جو چاند اور تاروں پر، حسین آبشاروں پر، مہکتے لالہ زاروں پر بہکتی، جھومتی رہیں
وہی نگاہیں آج بہ تدش و آرزو سے دور اپنی بے بسی کا شاہکار بن کے سو گئی تھیں قبر میں ــــ ــــ
جہاں نہ لالہ زار تھے، نہ چاندنی ــــــــ نہ مہ جبیں نہ لالہ رخ!
جہاں کوئی کرن نہ تھی جو ایک لمحہ کے لئے یہ مدتوں سے مسکرا کے جھانکتی!!
مرے خدا یہ قبر اتنی تنگ و تار و سرد و منجمد ہے کیوں ــــــــ؟
شکست ہوگا کب بھلا جمود کا یہ سلسلہ ــــــــ؟؟

میں سوچتا رہا، میں دیر تک یہ سوچتا رہا
کہ قبر میں کسی طرف سے روشنی ہوئی
تمام نور چھا گیا
سمجھ رہا تھا میں کہ جیسے چاند میرے پاس آگیا
مگر سکوت کا طلسم اجنبی صداؤں سے شکست ہو کے رہ گیا
نہ چاند تھا نہ چاندنی، نہ کہکشاں کا کارواں
فرشتے نور کے مرا سیاہ دفترِ عمل لئے کھڑے ہوئے تھے آس پاس
گناہ اور ثواب کے سوال اور جواب سے مرا دماغ تھک کے چور ہو گیا ــــــــ
ــــــــ میں خود کو پل صراط سے گذرتا دیکھنے لگا
جہنم اپنی پوری آب و تاب سے دہک رہا تھا پل کے نیچے دور تک

سنبھل سنبھل کے چلا — اٹھا پھر کسی لڑکھڑا کے گر پڑی میں پڑا
مہیب شعلے جھپٹ پڑے ———— ہزاروں مادۂ آتشیں مری طرف کو بڑھ چلے
میں خوف سے سہم گیا ڈر کے اپنے چاروں سمت دیکھنے لگا
مگر وہاں کوئی نہ تھا مدد کو وہ تند بیوں سے جو کھڑے تھے پل صراط پر
میں ان کے زہر خند سے لرز کے کانپنے لگا
میں جاگ اٹھا ———————— !
مری یہ موت کی ڈراؤنا سا خواب تھی ———— ؟ نہیں نہیں !!
یہ میری سوچ، میرے وہم کے بنے ہوئے مہیب جال تھے
کہ جن میں آج شام ہی سے گھر گیا تھا میں
ابھی تلک لرزہ اٹھتی سوچ کر گذشتہ منظروں کی ہولناکیاں
وہ موت کے فرشتے ———— نار آتشیں ——— بھڑکتے شعلے —— پل صراط ——— اور قبر کی اداسیاں !!

اور راستے میں قریب ہی خدا کے گھر میں کوئی نیک بندہ جاگ اٹھا
اذاں کی تلب گیر لے سے دیر تک فضا میں ارتعاش سا رہا
خمار شب اتر گیا ———— فضائے مضمحل کو ہوش آ گیا
مری تھکی ہوئی نڈھال روح کے تمام تار جھنجھنا اٹھے
اذاں کی قلب گیر لے! ———— شراب کی سی تند و تیز کیفیت ———— (اک اچھی خیال)
مگر یہ پردے اب ہمیشہ کے لئے سرک گئے ———————— میں روشنی میں آ گیا
سحر کے نرم دوش پر نئی نویلی شرم سے لجاتی اولیں کرن
دریچوں کو عبور کر کے میرے پاس آ گئی ———— (وہ اس کا لمس آتشیں!)
مری فسردہ منجمد رگوں میں زندگی کی سوچ برق دوڑنے لگی
میں جاگ اٹھا ! میں جاگ اٹھا !!

میں سوچنے لگا ————————
حیات کے لئے اک اور شاہراہ کھل گئی
مگر یہ زندگی جسے میں اپنے چار سمت دیکھتا ہوں یہ تو کوئی زندگی نہیں
فساد و ظلم و شر کی آگ میں سلگتی، سڑتی، تڑپتی، یہ زندگی
یہ آڑ لے کے دین کی ——— یہ مذہبوں کے نام پر ہر ایک سمت قتل و خون کی ہولناکیاں
یہ آدمی جن کے نام سے درندے بھی لرزتے ہیں !!
جو جی رہے ہیں مر رہے ہیں اپنی ہی لگائی آگ میں ———— !
یہ زندگی ———— ؟ نہیں یہ زندگی نہیں !! یہ زندگی کی موت ہے !!

وہ سامنے جھلستی ہے حیات نو کی شاہراہ ————
جہاں نفاق و شر نہیں
جہاں سب ایک قوم ہیں
جہاں محبتوں کی راہ میں رکاوٹوں کی تلخیاں نہیں
جہاں بلند و پست اور امتیاز نسل و رنگ کی سیاستوں سے پاک ہے فضا
جہاں سب ایک پرچم بلند و سرخ کے تلے کھڑے ہوئے جہاں کو امن و آشتی کا دیتے ہیں پیام !
وہیں پہنچ کے لوں گا دم ——— پھر اس کے بعد موت مجھ کو خاک میں ملا بھی دے تو غم نہیں !!
وہ دیکھ رہا ہے سامنے وہ میری منزل مراد کا نشان سرخ و باوقار ———— !!

اشعر ملیح آبادی

غزل

قفس میں جان کے مجبور و ناتواں مجھکو — دکھائی جاتی ہے تصویرِ آشیاں مجھکو
سمجھ کے حُسن کچھ اپنا مزاج داں مجھکو — دکھا گیا نہ دکھانے کی شوخیاں مجھکو
نقوشِ سعیِ محبت ذرا چمک تو جائیں — زمیں پہ آ کے نہ دیکھے جو آسماں مجھکو
فضائے شامِ اسیری میں رنگ بھرنا ہے — قفس میں لا کے جلانا ہے آشیاں مجھکو
یہ کس مقام پہ پہونچا دیا محبت نے — جہاں وصال بھی ہونے لگا گراں مجھکو
ازل نمائشِ جلوہ، جہاں مآلِ ازل — سکونِ ہوش ملے تو ملے کہاں مجھکو
یہ بزمگاہ پہ رسوائیاں ارے توبہ — بہار سے تو بدل دے کوئی خزاں مجھکو
ملا ہے برق کی شعلہ فشانیوں کیساتھ — جنونِ ہمتِ تعمیرِ آشیاں مجھکو

بہار دے کے چلی ہے عنایتاً حامد
غریب جان کے سرمایۂ خزاں مجھکو

حامد سعید خاں حامد

دو غزلیں

غم فراموش ہو نہیں سکتا
خارِ گل پوش ہو نہیں سکتا

آپ اِک زحمتِ نظر تو کریں
کون بے ہوش ہو نہیں سکتا

زیست کی لہر رُک نہیں سکتی
سازِ خاموش ہو نہیں سکتا

زندگی کھُل کے مِل نہیں سکتی
وہ ہم آغوش ہو نہیں سکتا

حوضِ کوثر میں مے کہاں ساقی
شیخ مے نوش ہو نہیں سکتا

تو ہے وہ لفظ نُطقِ ہستی کا
جو فراموش ہو نہیں سکتا

حادثے عدؔم کہہ رہے ہیں بھی
چارۂ ہوش ہو نہیں سکتا

عبد الحمید عدؔم

کہاں لیجاؤں اب یارب دلِ آشفتہ ساماں کو
زمانہ ہو گیا دیکھے ہوئے اس راحتِ جاں کو

ارے او ہنسنے والے میری دیوانہ مزاجی پر
ترے بلووں سے نسبت ہے مرے حالِ پریشاں کو

کیسے ملتے ہیں فردوسِ تصور کے مزے ناصح
خدا رکھے سلامت غمکدے کی شامِ ہجراں کو

کہیں دیدے نہ اپنی جاں تڑپ کر کوئی دیوانہ
خدا کے واسطے روکو نوازشہائے پنہاں کو

بیانِ درد و اظہارِ الم ممکن سہی لیکن
میں کن آنکھوں سے دیکھوں گا تری چشمِ پشیماں کو

تری نیچی نظر کی یاد کا عالم ارے توبہ!!
چبھو کر دل میں جیسے توڑ ڈالے کوئی پیکاں کو

یہ مہر و ماہ و انجم [illegible] سے کیا نظریں ملائیں گے
مری نظروں نے دیکھا ہے کسی کے روئے تاباں کو

مری بربادیوں پر تبصرے کرتا ہے اک عالم!
کوئی کہتا نہیں ان کے کرمہائے نمایاں کو

کیسے ملتے ہیں یہ زخمِ محبت کے مزے عرشی
مرے دل سے کوئی پوچھے جراحتہائے پنہاں کو

عرشی بھوپالی

منظرنامہ

گلدان کے پھول

طوفان سے پہلے — طوفان کے بعد

آبشار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

میراجی

منظر نامہ

جوتھے مینار سے وہ جس مکان میں رہنے لگا تھا وہ ایک بہت ہی اونچی عمارت کی سب سے اوپر کی منزل تھا۔ اور مکان بھی کیا؟ بس یوں سمجھیے کہ روزمرہ زندگی کی کھینچا تانی سے تھک کر تجربات کو پڑھنے کی جگہ تھی۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری۔ ایسی ہی کوٹھڑیاں اس کے دائیں بائیں اور سامنے بھی عمارتوں کی صورت میں موجود تھیں اور ان میں بھی اسی کی طرح شہری زندگی کی گھماگھمی سے رات کی رات بچنے کو لوگ پناہ لیا کرتے تھے۔ ہاں اس کی کوٹھڑی میں دو باتیں ایسی تھیں جو اوروں کو نصیب نہ تھیں۔ اگرچہ اس برتری کے لئے اسے کرایہ بھی تین روپے زیادہ دینا پڑتا تھا لیکن اس کی اسے پروا نہ تھی کیونکہ اس کے مقابلے میں فائدہ زیادہ تھا۔ ایک بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں اکیلا رہتا تھا، اور دوسری بات یہ تھی کہ کوٹھڑی کے ایک طرف ایک کھلی سی گیلری تھی۔ جب کبھی آس پاس کی سب دیواریں اس کے دل کی گھٹن کو بڑھاتیں وہ گیلری میں آن بیٹھتا۔ اور اگر فضا گرد آلود نہ ہوتی تو اسے دور تک ہر چیز صاف صاف دکھائی دیا کرتی۔ عمارت کے اس پہلو پر کوئی بازار نہ تھا، آمد و رفت کے ہنگامے کی آوازیں نہ آتی تھیں بس جہاں تک نظر پہونچتی عمارتیں ہی عمارتیں، عمارتوں کی چوٹیاں ہی چوٹیاں، اور ان اونچی اونچی منزلوں کو دیکھتے ہوئے وہ دل میں نجانے کیا سوچا کرتا، اور جب اس لگاتار سوچ سے تنگ آجاتا تو اپنا رخ ذرا دائیں جانب کو کر لیتا، اس طرف دور تک ساحل سے لگا ہوا سمندر گرد میں لپٹا تھا کنارے کنارے جہاں تک اس کی نگاہ جاتی وہ یہی دیکھتا کہ سمندر کے سینے سے اٹھتی ہوئی لہریں لپکتی ہوئی آخرکار ساحل سے جا ٹکراتی ہیں، اور پھر اسے اچانک خیال آتا کہ اس کے دل و دماغ میں جو لہریں اٹھتی ہیں کیا وہ بھی کبھی کسی ساحل سے جا ٹکرائیں گی کہ نہیں؟ اسی جھجک نے، اسی اندیشے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ زندگی کی لہریں اس کے سر سے گذر جائیں، زندگی اس کے سر سے گذر جائے مگر وہ ہمیشہ اپنے آپ میں ایک ساحل کی طرح ساکت و جامد رہیگا۔ بلکہ اس بات کی کوشش کرتا کہ اپنے آپ کو ساحل کے بجائے ایک ایسی چٹان، ایک پہاڑ کی بڑی چوٹی محسوس کرے جو ارارات کے پہاڑ کی طرح نوح کی کشتی کو اپنے سینے پر لگائے جس پر طوفان کے بعد ایک خفیف سی ہریالی رہ جائے، ایک پیڑ یا ایک پودا، یا اس پودے کی ایک ٹہنی، یا اس ٹہنی پر کوئی ایک پتا؛ لیکن آج اس اونچے مکان کی سب سے اوپر کی منزل میں، یہ ایک کوٹھڑی کی تنہائی اس کے خیالات کی لہروں کو متواتر جھکولے دیتی تھی، وہ اپنے آپ کو ٹہنی سے گرا ہوا ایک پتا تو محسوس کرتا تھا لیکن اس کی سوچ اور فکر ایک ہی نقطے پر جم جاتی تھی۔ جب وہ اس شہر سے بہت دور رہتا تھا ایک چھوٹے شہر میں ہر روز شام ہی سے دریا کے کنارے پر جا بیٹھتا۔ کنارے کے ساتھ ساتھ ایک پارک بنا ہوا تھا اور پارک کے ختم ہونے پر ایک بند سا تھا۔ یہ دریا شہر سے دور نہ تھا بلکہ بیچ ساتھ ہی کے ساتھ ساتھ اس کا کنارہ ہوتا ہے۔ اسی بند پر شہر کے سب لوگ بیٹھا کرتے۔ وہ پہروں دریا کے کنارے کی ریت کی پرلی طرف سڑک کی پٹڑی پر بیٹھے ہوئے وہ دیکھتا کہ تاروں بھری رات میں دوسرا کنارہ دھندلا سا کیسا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں تک پہونچکر خیال کی یہ تصویر اسے ایک ناکے کی مانند معلوم ہوتی جس میں صرف سیدھے ترچھے خم کھاتے ہوئے خطوط ہوں کہیں کہیں کوئی رنگ بھی ہو لیکن جو بھی رنگ ہو وہ ادھورا ہو، پھیکا پھیکا ہو، البتہ ایک رنگ ایسا تھا جو اسے بہت گہرا دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس کی اپنی ذات تھی، اپنا عکس تھا۔ لیکن عکس بے جان تھا، بغیر کسی مقصد کے۔ اگر وہ اس نقشے میں نہ بھی ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا اور یہاں پہونچکر اس کی سوچ جیسے تڑپ اٹھتی اور اس تڑپ سے سنبھالا لیتے ہی وہ پھر سے اس خاکے میں رنگ بھرنے شروع کر دیتا۔

دوسرا کنارہ دھندلا دکھائی دیتا ہے اور کنارے کے پیڑ مختلف شکلوں کے گچھے یا دھبے یا بادل ہیں، لیکن جب چاندنی رات ہوتی تو یوں محسوس ہوتا گویا دوسرا کنارہ بھی وہی کنارہ ہے جس پر وہ کسی بیراگی کی طرح آسن جمائے خاموش بیٹھا ہے۔ سامنے لیٹے ہوئے دریا کی

مچلتی ہوئی لہریں چاندنی میں چمک اٹھتیں اور وہ سوچتی کہ ایک بہت بڑا سانپ کنڈلی سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چاندنی میں دوسرے کنارے پر نظر پڑتی تو ہر چیز کتنی صاف دکھائی دیتی۔ کنارے کی مٹی کے نشیب و فراز بھی نظر آسکتے تھے۔ اور اکا دکا کوئی کشتی بھی نگاہوں میں آجاتی اور اس کے دل میں خیال آتا کہ یہ ملاح بھی خشکی کی دنیا سے الگ تھلگ ہمیشہ پانی کے سینے پر ہی تمام عمر بسر کر دیتے ہیں۔ اور صرف اپنی روزمرہ کی بعض ضروریات کے پورا کرنے ہی کو آبادی میں آتے ہیں۔ یہ سب کسی تخیلی دنیا کے رہنے والے ہیں! انجانی دنیا کا رہنے والا تو انسان کبھی میں بھی ہوں، لیکن کیا مجھے بھی کسی دن اپنی کسی خواہش یا کسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے اپنی دنیا چھوڑ کر اپنے آپ کو ان لہروں کے سپرد کرنا ہوگا؟ —— وہ یہاں پہونچکر پھر اس کی سوچ تڑپ اٹھتی اور وہ جیسے اس خیال سے بچنے کے لئے بیداری کا یہ خواب دیکھنے لگتی۔ اس خواب میں زندگی کی ہر تلخ حقیقت بادلوں کی طرح تحلیل ہو جاتی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے بہت دور —— ایک بڑھیا بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ چاند میں نہیں، وہ تو بہت دور ہے، اور پھر چاند کی بڑھیا تو چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے چرخہ کاتنے کے سوا کچھ نہیں جانتی۔ چاند کی بڑھیا تو سوچ نہیں سکتی۔ وہ تو ایک مشین کی طرح ہے۔ بلکہ کسی مشین کی تصویر کی طرح ہے، اور اس کے دونوں ہاتھ جانے کب سے جہاں کے تہاں دھرے ہیں۔ اور تاگے کا جو تار پونی سے نکل کر تکلے پر کھنچ چکا ہے وہ تکلے پر ابھی تک ویسے کا ویسا ہے۔۔ لیکن اس کے خیال کی یہ بڑھیا چرخہ ہی نہیں کاتتی، یہ تو صرف اپنی سوچ کے تار پر نجانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے اور پھر بار بار تھک کر لوٹ آتی ہے اور اپنے کو پھر وہیں اکیلی بیٹھی کچھ سوچتے ہوئے پاتی ہے اور اس بڑھیا سے بہت دور ایک چاند چمک رہا ہے، کبھی پورا کا پورا صاف دکھائی دیتا ہے، کبھی ہوا کے جھکولوں پر بہتے ہوئے کالے کالے، کچھ کچھ سفید بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ پھر ہر صورت میں جوں کا توں چمک جاتا ہے۔ چاند چیڑوں کی ٹہنیوں سے چھنتے ہوئے اس کی کرنیں نیچے بیٹھی ہوئی ایک گھیر چپ چاپ سی کھوئی ہوئی دھرتی پر مسافروں سے کانچ جیسے ایک سمت ایک الگ تھلگ بانسے بنا ٹیلہ چاہے اچانک آکاش پر اڑتے ہوئے بادلوں کی گھٹا اندھیرے میں کھو جائیں، اور پھر بیداری کے اس خواب میں اسے یوں محسوس ہوتا جیسے دن کے ڈھلے پر سورج ڈوبتے ہوئے نئے جیون کے اندھیرے میں کہیں بہت دور ڈوب چکا ہے اور ساتھ ہی خواب کے بوجھ تلے دبے دبے اسے خیال آتا کہ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ سورج کے چھپنے پر رات تو آیا ہی کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے خواب میں بہت دور بیٹھی ہوئی بڑھیا صرف یہ سوچتی رہتی کہ اندھیاری رات میں چاند کب چمکیگا؟ — اور ناامیدی کے اس گہرے اندھیرے سے کسمساتے ہوئے، پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ سر کو جھٹک کر نکلنے کی کوشش کرتا اور اپنے آپ کو گیلری میں تنہا بیٹھے ہوئے پاتا۔ اپنے آس پاس دیکھتا اور پھر اپنی طرف دیکھتا کہ سر کے بال سفید ہو چکے، بھنوؤں میں شاید کہیں کہیں کوئی دھندلا سیاہ خط دکھائی دے جاتا ہے، دانت ایک ایک کر کے نجانے کہاں رہ گئے، پچکے ہوئے گال گویا وقت کے گڈھوں سے بھرے ہوئے ہیں، ماتھے پر گہری سوچ بچار اور دنیا کے دکھ لکیروں کی صورت میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں۔ بلکہ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سانس کا آنا جانا بھی کچھ اتفاقی سا ہے۔ اور وہ آس پاس پھیلی ہوئی دھرتی پر جیسے ایک نقطے پر کھڑا ہے۔ بلکہ یوں کہئے گویا ستانے کے لئے دم بھر کو بیٹھ گیا ہے، اور معلوم نہیں کب یہ نقطہ بھی اس کے پیروں تلے سے کھسک جائے۔

چاروں طرف ہر آن زندگی کے ہنگامے کے باوجود ہر سمت ایک دھندلکا چھایا ہوا ہے اور اس دھندلکے میں سے ننھے ننھے بچے آتے گھومتے ہیں، کوئی حیرانی سے تکتا رہتا ہے، کوئی منہ بسورے، کوئی مسکراتے ہوئے، ہنستے ہوئے، کوئی..........

گھر کے سب لوگ تیار ہو چکے تھے، صرف نجمی کو نیا فراک پہنانا باقی تھا۔ آج سب ماما جی کے یہاں جائیں گے۔ ماما جی یہاں سے ریل کے چند اسٹیشن چھوڑ کر رہتے تھے۔ وہ بھی ریل کے ملازم تھے، ورنہ پتاجی بھی۔ چھوٹی ریلوے تھی، ڈھائی فٹ چوڑی پٹری۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارے دس بارہ کے آٹھ دس اسٹیشن۔ گویا گھر کا محلہ تھا۔ نجمی کو فراک پہنا دیا گیا، سب گاڑی میں بیٹھ گئے، گاڑی چلی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آدھے رستے میں پڑتا تھا، یوں تو اس جگہ گاڑی صرف پانچ دس منٹ کے لئے رکتی تھی، لیکن کچھ دیر رکے۔ جنکشن سے بھی ہو جاتی تو کیا ہے۔ گھنٹیاں لیٹ بھی تو ہوا کرتی ہیں۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کوئی پوچھ پڑتال کرنے والا نہیں

[illegible] ہوئی

[illegible] کو ایک [illegible]

[illegible]

[illegible] خیال [illegible]

[illegible] دکھائی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لیکن [illegible]

خیالی دھندلکے سے نکل کر وہ چچا سے گھورتے ہوئے دکان [illegible] وطن سے دور

[illegible] کی نظر بچا کر [illegible] سے [illegible] کچھ دور

اور لگانے جا سکتے تھے۔ اس سلسلے میں [illegible] سب [illegible]

[illegible] کچھ خریدنے [illegible] ان کی نظر [illegible]

[illegible] خیال ہی خیال میں اس کی [illegible] سے بچ کر دوسری طرف

[illegible] بڑے شہر میں سیر کی غرض سے

آئے۔ چچا [illegible] سامان کی خریداری کو آئے ہیں۔ بڑی بڑی دکانیں [illegible] لوگوں کا ہجوم ہے۔ اور

[illegible] بازار [illegible] بچے کو اگر ایک کنارے پر کھڑا کر [illegible] نہیں ہو سکتا کہ دوسرا

کن [illegible] چاندنی چوک [illegible] کی دکان میں [illegible] داخل ہوئے۔ چچا تو سامان خریدنے میں مصروف

ہوئے، بچہ خرید و فروخت کی غیر دلچسپ [illegible] بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں ایک کھلونے والا

سامنے سے گزرا، سر پر چھابا تھا اور ہاتھوں میں [illegible] کی جیب میں دو پیسے تھے،

چچا کی نظر بچا کر دکان سے نکلا اور کھلونے والے کے پیچھے ہو لیا۔ اتنی سی دیر میں کھلونے والا نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا

[illegible] ہجوم میں کھو گیا۔ کھلونے والا تو [illegible] دکان کا رستہ بھی نہ سوجھتا تھا۔ بے بسی کی حالت میں رونے لگا۔

[illegible] کون تھا؟ بچے کو کیا معلوم کہ کہاں جا [illegible]

[illegible] ساتھ تھے [illegible] معلوم ہوتا [illegible] کھلونے والے کو

[illegible] معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پھر [illegible] دو چار یہاں، دو چار

وہاں [illegible] کوئی کسی [illegible] کوئی

[illegible] میں مصروف تھیں اور کچھ [illegible] ایک آدھ کو

[illegible] ایک بچہ کسی پودے سے ایک [illegible] پھول

توڑ لایا اور دوسرے بچوں کو دکھانے لگا۔ دیکھو کتنا بڑا پھول ہے۔ وہ سب کھیل کو بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے [illegible]

میں لے لوں [illegible] مجھے دے دو۔ [illegible] تم بھی [illegible] اس پودے سے توڑ [illegible] ہاتھ وہاں تک نہیں

پہونچے گا۔ تم اپنا پھول مجھے دے دو [illegible] دوسرے بچے کو [illegible] شروع ہوئی [illegible] لگے

[illegible] ہوئے [illegible] سب کو الگ [illegible]

[illegible] بیگم

گلدان کے پھول

دادی اماں کی کہانی کس نے نہیں سنی ہاں ہاں وہی "ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا بادشاہ" [illegible] تو ہر بادشاہ [illegible]
کہیں یوں تو اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ دھن دولت، نوکر چاکر، دور دور تک پورب سے پچھم تک [illegible]
کوئی خوشی ایسی نہ تھی جو ان کے قدم نہ چومتی۔ دن عید تو رات شب برات [illegible]
اور بس یوں سمجھو اس پر کہانی شروع ہو گئی ——

ہمارے قصے کا بادشاہ خدا بادشاہ نہیں تو کم سے کم اس دنیا کا بادشاہ تو تھا [illegible]
کون واقف نہیں تھا۔ ہر طرف ان کے نام کے ڈنکے بجتے تھے۔ بس یوں سمجھو کہ گل بکاؤلی کے اس بادشاہ [illegible]
پریاں ان کے نام سے بہا گئی تھیں۔ دولت اور عزت سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ [illegible] ایسی تھی جو دن رات [illegible]
کی طرح لگی رہتی۔ بیاہ بیٹا [illegible] بڑے [illegible] جاگیر [illegible] چار کو [illegible] چھوٹی بہو [illegible]
بیاہ [illegible] پوچھتا ہے۔ جہاں [illegible]
سمجھ لو گلدان سے ہاتھ دھوئے۔ وہ [illegible] نہیں تو [illegible] کبھی [illegible]
چکنی [illegible] ہونے کے لیے آئے۔ —— خیر تو یہی حال چھوٹی بہو کا [illegible] کہا جا [illegible]
چکے کہ۔۔۔ شہزادی [illegible]
[illegible] کا نقشہ [illegible] کا خیال رکھنا [illegible]
[illegible] تو بھوک [illegible] ۔۔۔

[illegible] جیسے [illegible] ——
[illegible]
[illegible]
"[illegible] جس گھر جائے گی آگ لگا دے گی"
"[illegible]"
"بوا چراغ لیکر ڈھونڈے"

[illegible]

پسند ہونی چاہئے۔

اللہ کا دیا سب کچھ ہے پیسہ کا کیا غم ——— اور پھر پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔

اُس روز کی بات ہے جب منیجر نے کہا کہ "حضور اگر کہیں تو پرانی موٹر بیچ دوں، بیکار پڑی ہے۔ یوں بھی نئی موٹر کا آرڈر گیا ہوا ہے"۔

"بدتمیز، کوئی کیا کہیگا کہ یہ زمیندار امداد خاں ہیں جو پرانی چیز بیچتے ہیں، پڑی رہنے دو کبھی کام ہی آ ئے گی" اور بہو کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، پر کیا کرتی دم نہ مارا ——— اُدھر امداد خاں کو زمینداری کی لاج رکھنی تھی۔ مگر بہو یوں ہی جل کر رہ گئی، نہ جانے زمیندار امداد خاں کے یہاں اس کی یہ صاف گوئی کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ تو یونہی گم سم رہتی کھیل تماشے دیکھتی اور لب نہ ہلاتی۔ جیسے زبان کو لگ گیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی وہ نوکروں کو جھڑک کر اپنے دل کا بخار نکال لیتی۔ پھول پھینکتے پھینکتے شیشے کے گلدان تک پھینک کر توڑ دیتی۔ پھول مرجھاتے ہیں مگر یہ گلدان جوں کے توں رہتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی فرق نہیں آتا، شاید اس لئے کہ پھولوں کا کیا ہے اور تر و تازہ پھول آکر ان گلدانوں میں سج جائیں گے۔ وہ جل بھن کر گلدان اُٹھا کر پھینک دیتی۔ یہ تو اس گھر کا دستور ہی ہے کہ ایک چیز خراب ہوئی، جھٹ دوسری اُس کی جگہ لاکر رکھدی گئی۔ یہ میز ایک دن بھی تو گلدان اور پھولوں سے خالی نہیں رہتی۔ رات بس پھول مرجھائے اور صبح ہی یہ گلدان پھر نورس کلیوں سے بھر گئے۔ یہ سب کھیل پیسہ کا ہے اور پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ تکیہ دن یونہی گذرتا اور رات کو تو وہ ایسی پٹیوں سے لگ کر سوتی کہ کتنا ہی کوئی جھنجوڑے کبھی خود وہ اپنی جگہ سے ہل سلے اور وہ پڑا ڈالے توسد اُس کے سینہ سے چمٹا رہتا، بغل کا تکیہ ضرور ہو ——— اور اس بغل والے تکیہ سے تو زمیندار امداد خاں نے بھی ہار مان لی تھی وہ سوتی تو ایسے کروٹ پٹ کر کے سوتی کہ کبھی جو کانی آنکھ سے بھی دیکھ لے اور اسی پر زمیندار امداد خاں جل بھن کر رہجاتے۔ کیا بیوی ملی ہے تالاب کا پانی ہے کتنا ہی چھیڑو کبھی جو پانی کی لہر میں سانس لیں۔ مگر وہ کہتے تو کیا بس غصہ ہی پیتے رہتا۔

"بیگم کیا بات ہے اُٹھو بس سو چکیں" امداد خاں نے جھٹ سے اُٹھ کر سامنے کا پردہ بھی گرا دیا اور مسہری پر آگئے "لاحول" پڑھو شادی کو ڈیڑھ دو سال ہونے کو آ ئے مگر آج تک بیگم سے کھل کر بات نہ کرسکے۔ مہمان کی طرح گھر میں آئے خیریت پوچھی اور پھر چلدیئے وہ یہ سوچتے ہی رہ جاتے "آخر بات کیا کروں" ——— انھوں نے آہستہ آہستہ اُس کے شانوں کو ہلایا مگر بیگم نے دوسری کروٹ لی اور دنیا و مافیہا کے ساتھ زمیندار امداد خاں سے بھی بے خبر ہو کر سو گئیں۔ لاکھ سوال اور اس کا ایک جواب۔

اور زمیندار صاحب پر جیسے پانی پڑ گیا۔ کن ارادوں سے گھر میں گھسے تھے اور کیا ہو گیا۔ اُن کے دل میں کتنی حسرت تھی کہ بیوی کے نرم نرم بازو پر لیٹ سکیں اور افسردہ قسمیں دے دلا کر اپنے سر کو اُس کے بازو کی نرم نرم تھرکتی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھ دیتے تو بس کچھ نہ پوچھو اُن کا کیا حال ہوتا۔

"اجی ہٹاؤ اپنا سر ——— جگہ بے جگہ گھونسے کے سے بال گرا دیتے ہو۔ دیکھتے نہیں بازو پھٹے جا رہے ہیں، اور یہ داڑھی ——— ہٹو پرے کوا ونہہ ——— کیا کرتے ہو مجھے یہ چوہا جانی بھلی نہیں لگتی" اور تب تو وہ زمیندار امداد خاں کی بیوی نہیں اپنی ابّا کی بیٹی معلوم ہوتی ——— زمیندار امداد خاں کا سر نڈھال ہو جاتا کیسی بے بس ہرنی ہے کہ قابو ہی میں نہیں آتی، جتنا پیچھے دوڑو اور چوکڑی بھرتی ہے اپنی بیوی ہے اس پر یہ حال ——— پھر بھی وہ اپنے اس حق کو ہنوز نہ جتا سکے۔ کتنا ارادہ کیا کہ ایک دن کہدیں، پر نہ جانے کیوں ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے زبان تالو سے چپک گئی۔

"بیگم ——— تم میری بیوی ہو" وہ بولنا تو چاہتے لیکن الفاظ جیسے حلق میں پھنس گئے ہوں، زبان پر کسی نے تالا ڈال دیا ہو وہ تو ڈانٹ سن کر بیسیار خوچکر ہو سکے کہ دیوان خانے ہی میں جاکر دم لیتے ——— بالکل ناک کی دوڑ کی طرح ——— ایسے موقع پر اُنکی تیغ تیز دھار بھی کند ہوتی ——— نوکر چاکر کو آواز دی، اور وہی نادر شاہی حکم ——— سنتے ہو تو وہ کوئی

زنانخانے میں نہ جاسکے، جو کام ہو بڑی بی کو آواز دو۔ اس بھورے کی اور بات ہے یہ جا سکتا ہے۔"

نوکر اس بے بات کی بات کا مطلب بھی کچھ نہ سمجھ پاتے "واہ زمیندار صاحب واہ"۔ ——— گر کس کی ہمت جو دم مار سکے اس وقت تو چہرہ خوفزدہ بنایا اور اُدھر وہ ہٹے پھر دل لگا کر بھڑاس نکال لی ———

"ارے جوان چھوکری ہے نا۔ اس عمر میں نہ جانے دوسری شادی کی کیا پڑی تھی ورنہ وہ بھی جوان تھیں ست"

"تو پھر کیا بڑھیا سے بیاہ کرتا ——— بنگم پور کا زمیندار اور جوان چھوکری بھی نہ ملتی۔ ابے خوشامد کر کے لوگ لڑکی پٹکتے ہیں۔"

——— ایک نہیں ہزار ——— پیسہ ہو تو کیا جنت سے حور آسکتی ہے" دوسرے نے تڑاق سے منہ پر بات ماردی ———

"اور کیا ——— اب اس بھورے کو کون لونڈیا دیگا" وہ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ زمیندار صاحب کی گرجدار آواز نے وہیں بات کاٹ دی۔

"ابے کلو کے بچے بھیجنا ذرا بھورے کو"

"جا بے بھورے کے بچے" کلو نے بھورے کے بچے کہہ کر انتقام لیا"

"جا زمیندار صاحب بلاتے ہیں، تیری تو پو بچیس ہے ——— دیکھ بیگم صاحبہ بن ٹھن کر بیٹھی ہوں گی"

"تو ——— تو کیوں نہیں چلا جاتا"

"ابے مجھے اجازت کب ہے، تیری تو اور بات ہے تو بچہ ہے" اور بھورے میاں جھینپ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا جیسے کسی بڑے فرش کو داغدار کر رہا ہو مگر بے عزتی کا ہلکا سا احساس اُس کے دل میں چٹکیاں لینے لگا ———

"ابے بھورے ——— سارے شیو کا سامان اور غسل خانہ ٹھیک کر"

بیگم صاحبہ بھورے کو دیکھ کر کروٹ لینے لگیں جیسے ابھی تو جاگی ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اُنھوں نے سرہانے سے دوپٹہ اٹھایا اور لاپرواہی سے شانوں پر ڈال لیا۔ بھورے کی نظر پھر بھی بچتے بچتے بیگم صاحبہ کے جسم پر پڑ ہی گئی۔ وہ دوپٹہ کا مصرف بھی نہ سمجھ سکا نہ جانے یہ کپڑے کا ٹکڑا اوڑھا ہی کیوں جاتا ہے، اس سے کچھ بھی تو نہیں ڈھکتا چھپتا۔ بیگم صاحبہ کے بازو کی گرفت تو بغلی تکیہ سے یونہی ڈھیلی ہو گئی تھی اور اب اُن کے بازو اُس بائیں برہنہ اطمینان سے رکھے ہوئے تھے ان کا تنفس تیز ہو رہا تھا مگر وہ اپنے شانوں کی مچھلیوں کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

مگر زمیندار صاحب کی کھانسی نے بھورے اور بیگم دونوں ہی کے خیالات کو اس طرح بکھیر دیا جیسے اُنگلی کے اشارے سے تاش کا بنا بنایا گھر گر جاتا ہے اور آواز تک نہیں ہوتی۔ بھورے کے قدم اور تیزی سے اپنے کام کے لئے اُٹھنے لگے جس کو وہ قریب قریب بھول ہی چکا تھا۔ اُدھر بیگم نے اپنے دوپٹے کے مصرف کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک سے ڈال لیا اور مسہری پر پہلے کی طرح اینڈتی رہی جیسے سارا بدن ٹوٹ رہا ہو۔ اور پھر دوسرے لمحے ان کا جی چاہتے لگا کہ گرم گرم مضبوط ہاتھ اس کو سختی سے بھینچ دیں ——— تھوڑی دیر میں بھورے میاں بھی زمیندار صاحب کے حکم کی تعمیل کر چکے تھے۔

"کیوں بے بھورے کتنی عمر ہوگی تیری"

"مجھے معلوم نہیں سرکار" اس نے بھولے پن سے کہا۔ بیگم صاحبہ بھی پورے طور سے اُٹھ چکی تھیں اور مسہری پر سے پیر لٹکائے ہوئے انھیں ہلا رہی تھیں زمیندار صاحب کو بھی اُن کے اُٹھنے کا علم ہو چکا تھا۔

"اس کی عمر ——— ہوگی کوئی تیرہ چودہ برس کی"

"تیرا چودہ ——— ارے بیگم ہوگا کوئی اٹھارہ کا۔ دیکھتی نہیں شانوں کی مچھلیاں کیسی ابھر آئی ہیں"

سچ مچ شانوں کی مچھلیاں سیاہ بنیائن سے اس بری طرح ابھری ہوئی معلوم ہو رہی تھیں کہ بیگم صاحبہ بھی زمیندار صاحب کے سامنے شرما گئیں اور کچھ نہ بول سکیں۔ بھورے میاں کا بس چلتا تو وہ چھپا لیتے ان مچھلیوں کو جو نہ جانے کیوں بنیائن سے نکل کر ایک ایک

[illegible] گئی تھیں۔ اس نے زمیندار صاحب اور بیگم صاحبہ کی نظروں سے بچا کر اپنا بنیان موپر کو تھما دیا، مگر تو یہ کر دی جچھپایاں [illegible] بات بھیا۔۔ چھپتی ہیں۔

[illegible] بات آئی گئی ہو گئی۔ زمیندار اماد خاں شیو کرنے میں مشغول ہو گئے۔ نظریں آئینہ پر جمی ہوئی تھیں۔ مونچھیں بچا بچا کر داڑھی پر [illegible] طرح رینڈ رہا تھا ـــــ مگر تیور بتا رہے تھے کہ کوئی پریشانی محاصرہ کئے ہوئے ہے، لیکن بیگم صاحبہ تو شاید ان تیوروں کی عادی ہو چکی تھیں، وہ خاموشی سے غسل خانہ میں چلی گئیں۔ زمیندار اماد خاں بدستور اپنے کام میں لگے رہے۔ اپنے خیالات میں غلطاں ـــــ کیا بیوی ملی ہے جو اس طرح ستے دیتی رہتی ہے، کبھی پھوٹے منہ بات نہیں کرتی۔ اس سے تو بڑی بہو غنیمت تھی۔ مگر دس برس کے بعد بھی تو اولاد نہیں ہوئی۔ آخر گھر کا چراغ نہ ہو تو بیوی کس کام کی۔ کوئی منہ دیکھنے کو تو بیاہ نہیں کرتا، سی لئے تو میں نے اس کو میکے بھیجا اور یہ شادی کی ـــ نئی سی تو کر چھوڑی، وہ دادا نہ بھی کچھ ہزاروں روپیہ پانی کر دیا پر اولاد نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔ ہزاروں مزار لئے پھرے۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب ہی کی دوائیں کھلائیں، آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے اور جب بالکل ہی ناامید ہو گئے تب کہیں اس کو میکے بھجوایا اور پھر یہ شادی کی ـــــ اُن کے خیالات کا سلسلہ اچانک استرے کے لگ جانے سے ٹوٹ گیا۔ ڈاڑھی سے خون نکلنے لگا "اونہہ" اُنھوں نے آہستہ سے کہا اور پھر ان کو خیال آیا کہ خواہ مخواہ کے لئے بڑی بیگم کو گھر والوں سے جھگڑے مول لئے، محلے والوں کی باتیں الگ سنیں۔

"[illegible] شوہر جوان ہو گئی اور دوسرا بیاہ رچا رہا ہے"

"[illegible] غضب ہے غضب بیاہتا پر سوکن بٹھا رہا ہے، شرم نہیں آتی"

مگر کسی کسی نے تو اس کی تسلی کے لئے یہ بھی کہدیا

"ارے بھئی اولاد کے لئے آدمی کیا نہیں کرتا۔ یہ اولاد آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ کتنا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا، بڑے پیر صاحب، خواجہ صاحب اور نہ جانے کہاں کہاں گئے، کتنی آرزو تھی کہ کوئی کہے کہ "بیگم کا پیر بھاری ہے" مگر وہ تو چٹاخ چٹاخ پھرتی رہی۔

یہ باتیں [illegible] زمیندار اماد خاں کو کچھ ڈھارس سی بندھی، نئی موٹر کے ہارن کی آواز ان کے کانوں میں آئی مگر پھر جیسے غیب کی سے تسلی دی، آخر موٹر بھی تو دوسری خریدنی پڑی تھی، جب تک کام چلتا ہے ٹھیک ہے نہیں تو پھر دوسری سہی۔

چھوٹی بیگم صاحبہ غسل خانے سے نکل آئیں اور ابھی تولیہ سے منہ بھی نہ پونچھ پائی تھیں کہ تلانی بی نازل ہو گئیں ـــــ

"اونہہ ـــ" انھوں نے ناک سکوڑی "گھر کا بھی کچھ حال سناؤ گی تلانی بی"

"ہاں ـــ ہاں ـــ بیٹا کہہ تو رہی ہوں۔ سب اچھے ہیں۔ بس اپنی بنو کو یاد کرتے ہیں صبح سے شام تک یہی بیراگ ہے ـــ [illegible] تو ہوتی ہے۔ اپنی بنو تھی تو کیا گھر تھا، کیا چہل پہل تھی ـــ بس بیٹا تو کیا گئی کہ میرا تو جی نہیں لگتا۔ گھر جیسے منہ پھاڑے کھانے [illegible] ہے ہو کی [illegible] وقت تو تم باتیں ہوں۔ بس [illegible] کیا ہوا وہ گم سم رہتی ہیں۔ بچارے کا کیا مرا، ان کا عیش و آرام سے [illegible] [illegible] پھ [illegible] نکلیں [illegible] ـــــ بس منہ لپیٹے سارا دن یونہی گذر جاتا ہے"

[illegible] تلانی بی [illegible] ہے تو پھر کہاں [illegible] زمیندار اماد خاں غسل خانہ میں پہونچ چکے تھے، پانی کی چھڑ چھڑ اُن کے [illegible] تلانی بی نے [illegible] دوڑائیں جیسے [illegible] کی بات کہہ رہی ہوں

"[illegible] بیٹا بڑی سست [illegible] ہو [illegible]"

[illegible]

نہیں کرتے۔ بیچاری وہ بھی مجبور ہے۔ تو بیگم صاحبہ سے کہوں گی کہ بس اب بلالیں۔ اللہ خیر سلامت ہو ہوا سے تو پھر بھی چھوڑا نہ جائے گا۔ ملانی بی کی چرخی چل رہی تھی اور بنو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ ملانی بی کی بات پر ہنس بھی نہ سکی اور اس پر ملانی بی کو اور بھی یقین ہو گیا کہ چہل پہلوٹی کی بات ہے، جواب بھی کیا دیتی۔

"ملانی بی تم تو بیکار باتیں کرنے لگی ہو لے چلنا ہو تو یوں ہی لے چلو۔ میری طبیعت بہت خراب ہے۔ میرا بس چلے تو یہاں قدم بھی نہ رکھوں، ایسا جی چاہتا ہے کہ کہیں منہ چھپا کر نکل جاؤں۔ مجھے یہ گھر زہر لگتا ہے" اس نے قدرے غصے سے کہا اور ملانی بی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا جو اس کے کانوں نے سنا۔

"خدا کا نام لو بیٹی، کیسی باتیں کرتی ہو۔ ایسی باتوں سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے اور بندے بھی۔ میری بنو جس گھر میں ڈولی اُترے اُس گھر سے تو جنازہ ہی نکلنا چاہئے۔ اللہ رکھے اس گھر میں تم کو ہر طرح کا سکھ ہے، نوکر چاکر ہیں، موٹر گاڑیاں ہیں اور کیا چاہئے سکھ ہی سکھ۔ خدا ہر ایک کی بچی کا ایسا ہی بھاگ کرے۔ دیکھو تمہارے لئے زمیندار صاحب نے اپنی بیاہتا تک کو چھوڑ دیا۔ بری بات کبھی زبان پر مت لاؤ۔ کوئی تکلیف ہو تو زمیندار صاحب سے کہو اور تم بھی ان کا خیال رکھنا، بیٹی خدا کے بعد اگر کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو وہ خاوند ہے، مجازی خدا۔ ان کے قدموں میں رہو دین اور دنیا دونوں تم کو ملیں گی۔ اور زمیندار امداد خاں وہ رہے ان کی کیا آن بان ہے۔ خدا سب لڑکیوں کو ایسے ہی بر دے۔ وہ تمہارے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ کر لانے کو تیار ہیں۔ اسی روز جب بوا کے پاس گئے تھے تو کہتے تھے کہ بس بوا گھر میں سب کچھ ہے کمی ہے۔ وہ کرے کہ اللہ اولاد دے تو ہر سال قصبہ بھر میں شادیانے بجواؤں گا۔ چراغاں کروں گا —— چراغاں" اور پھر ملانی جی نے چاروں طرف دیکھا۔

"اللہ بڑی پرلاج ہے ہم کو نہیں، بوا کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے ذرا لاج نہ آئی" انھوں نے قدرے آہستگی سے کہا، پھر وہ دیوار کی طرف دیکھنے لگیں۔ آخر دیوار کے بھی تو کان ہوتے ہیں اور وہ بھی زمیندار امداد خاں کے گھر کی دیواریں —— بڑے آدمیوں کی بات کچھ اور ہی ہے۔

پھر بنو جو سر جھکا کر بیٹھی تو ایک حرف زبان سے نہ نکلا۔ وہ بار بار یہ سوچ کر گھبرا رہی تھی کہ خواہ مخواہ کو زبان کھولی جو یہ نصیحتوں کا پوتھا کھل گیا ہے۔ چپ بھی تو نہیں ہوتیں، بس اپنی ہی لگائے ہوئے ہیں۔ بنو نے دماغ کی کھڑکی بند کر لی تھی۔ زمیندار صاحب تنہا بھی چپ تھے، مگر ملانی جی کی چرخی بھلا کہاں بند ہونے والی تھی۔ بڑھیا کے چرخہ کی طرح دھاگہ ٹوٹا اور پھر جوڑا، کمال یہ کہ سننے والے کو پتا تک نہ چلا کہ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ کھانے پکانے سے لیکر مرغی بطخوں تک کا حال سنا ڈالا "ولایتی نسل کی مرغی کے دس انڈے تو سنے ہیں بیٹا" زمیندار امداد خاں بھی ہنسی نہ ضبط کر سکے ان کو ہنستا دیکھ کر ملانی بی نے ان کی طرف رخ کیا۔ بنو نے سوچا چلو جی —— تو چھوٹی۔ ورنہ پتا نہیں کب تک ملانی بی کی آواز بھی سنائی دے۔ یہ تھی کہ ان دونوں کی باتوں سے بیزار تھی —— اور —— تھے۔

"کیوں بیٹا اچھے تو ہو"

"ہاں ملانی بی، بس زندہ ہیں اور کیا!"

گود بھی بھر دیں گے، خدا کا نام لیکر جاؤ۔

اور پھر زمیندار صاحب اور امداد خاں یونہی بیٹھے رہے۔ ان کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ ملانی بی کا لکچر کب ختم ہوا اور کب وہ گئیں۔ مگر ننھے ننھے خیالات ان کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں تین مہینہ کا پروگرام بن گیا، چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

"بیگم ایسے کب تک کام چلیگا" اور بیگم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں "آدمی کو اپنی سی تو کرنی ہی چاہئے مجھے یقین ہے کہ اللہ چاہے گھر میں بھی بچہ دیگا۔ نہیں تو یہ جائداد خدا نے یتیم خانے کے لئے دی ہے۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ کب آنکھ بند ہو جائے۔ آج زمیندار صاحب پھر اسی انداز سے بول رہے تھے جس طرح اب سے دو تین سال قبل اپنی پہلی بیوی سے بولا کرتے تھے۔

بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کے دل پر کسی نے بھاری پتھر رکھ دیا ہو اور وہ منوں بوجھ تلے دبی جا رہی ہو، مگر اُس نے اس بات کو زمیندار صاحب پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

اگلے روز بڑے آن بان سے زمیندار اور امداد خاں کی موٹر ایک لمبے سفر کے لئے جا رہی تھی اور کسی کے کان میں بھنک تک نہ پڑ سکی کہ وہ کدھر جا رہے تھے۔ سفر لمبا تھا، مگر موٹر کے ہارن کی آواز آئی پھر "کیا دو پہیئے گردش کرنے لگے۔ رک کر جا کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ پیچھے دھول اڑ رہی تھی اور موٹر کا نشان تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ زمیندار اور امداد خاں واپس آ چکے تھے۔ امید اور ناامیدیوں کے درمیان زندگی گزر رہی تھی۔ موٹر جنگلوں اور کھنڈروں میں چل کر کچھ خراب ہو گئی تھی۔ مگر انہیں کہیں جانا تھوڑی ہی تھا، جو دوسری موٹر کی ضرورت ہوتی۔ ادھر بنو کی زندگی کے ٹوٹے ہوئے پہیئے گھسٹ رہے تھے، وہ بیمار سی رہنے لگی۔ ہر وقت جیسے سر میں کوئی چیز ناچ رہی ہو، ادھر سرہانے میز پر دوائیں پڑی تھیں۔ پھلوں کا انبار لگا تھا۔ اس کا کمرہ زندگی کی ہر چیز سے بھرا ہوا تھا، اگر کوئی کمی تھی تو اس کی کہ خوشی نہ تھی۔ ایک نیا ریڈیو سٹ بھی اس کمرہ میں رکھا ہوا تھا، جو بیگم صاحبہ کی مرضی پر نوکر کی طرح کام کرتا تھا، مگر خوشیاں نہ جانے کیوں خریدنے پر بھی نہیں ملتیں۔ بنو خوش نہ تھی، اب تو زمیندار صاحب کا سر بھی شدھ‌ل ہو چکا تھا، ملانی بی بھی کبھی کبھی آتیں، بوا نے بھی دو ایک چکر لگائے، بنو نے کتنا ہی کہا کہ گھر چلوں گی مگر بوا کی ایک نہیں ہزار نہیں۔ "میری بنو جم کے دوا ہو جائے وہ پھر اطمینان سے چلنا جیسے دو گھر ویسے یہ بھی کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ۔" اور یہی ایک بات بنو کو خاموش کرنے کے لئے کافی تھی، اکثر وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر الفاظ حلق میں پھنس کر رہ جاتے۔ وہ کیا کہے وہ بھی ماں سے یا ملانی بی سے، اس کو لاج نہیں آتی، اور وہ دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی۔

دو کا وقت ہو گیا تھا، بڑی بی نے دوا پلائی، بھولے میاں کا بھی گھر میں آنا بند ہو چکا تھا۔ پر نہ جانے کیوں بیگم بھی اس کے شانوں کی گھلیوں کو بھول چکی تھیں اور ان کی اپنی پھلیوں نے بھی اچھلنا کودنا بند کر دیا تھا ———— !

(بقیہ صفحہ ۲۰)

ان سے کچھ ہی دور ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے یہ سب کچھ دیکھا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اُس کے تصور میں ایک اور ہی بچہ تھا، بالکل ان بچوں کا ہمجولی، لیکن بالکل اس کے اپنے ہی جیسا اور آج یہ ان دیکھا اور انجانا بچہ بھی گیلری میں بیٹھے ہوئے تنہا انسان کو تک رہا تھا اور اس کی جھنک سے تڑپ کر وہ یہ سوچنے لگا۔ میرے سر کے سب بال سفید ہو چکے ہیں۔ کاش! جس نقطے پر میں دم بھر کو سستانے کے لئے بیٹھ گیا ہوں وہ میرے پیروں تلے سے کھسک جائے ———!

زکی انور

طوفان سے پہلے ۔ طوفان کے بعد

بارش رک چکی تھی۔ مگر گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ ڈاکٹر رضوی نے پنکھا ذرا تیز کر دیا۔ اس کی میز کے کاغذات پھڑپھڑانے لگے۔ اس نے کاغذوں پر قرینے سے پیپر ویٹ رکھ دیا اور خود قدرے اکتاہٹ سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

باہر بجلی ابھی تک چمک رہی تھی اور کچھ کچھ دیر پر بڑے زور سے بادل گرج جاتا تھا۔ ڈاکٹر رضوی نے بڑی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ بادل دل کے دل امڈے آ رہے تھے اور فضا آہستہ آہستہ خاموش ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرح کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ بادل کی کڑک بند ہوتی جا رہی تھی۔ صرف دور آسمان پر تیز سی سیدھی تلواریں چمک جاتی تھیں۔ کالی گھٹا [illegible] اور چھایا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر رضوی نے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ جگمگا اٹھا۔ اس کا کمرہ بالکل خاموش تھا۔ صرف پنکھے کی ہلکی سی [illegible] پھیلی ہوئی تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک۔ ڈاکٹر رضوی نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے وہ اس خاموشی سے اکتا رہا ہے۔

پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا اور زیر لب کچھ گنگنانے لگا۔ پھر وہ میز سے لگی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر پھر اپنے دوست کے خط پر پڑی۔ جو اس شہر سے پچیس میل کی دوری پر ایک دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ وہ بھی ڈاکٹر تھا۔ اور وہ علاقہ میں پھیلی ہوئی وبا ۔۔۔۔ ہیضہ، چیچک اور پلیگ کو روکنے والی کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے دوسری جگہ جا رہا تھا۔ اور اس نے ڈاکٹر رضوی پر بھی زور دیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے اور کمیٹی میں شامل ہو جائے۔ ویسے بھی ڈاکٹر رضوی اپنے دوست کی بات کو رد کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ دوست اس کا دوست تھا۔ اور پھر کمیٹی میں شامل ہونا تو عین اس کے ذوق کی چیز تھی۔

بنگال کے قحط کے زمانہ میں ڈاکٹر رضوی میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ تو بھی اس نے کنگالوں میں کام کرنے والی کمیٹی میں شامل ہو کر ان کی بڑی خدمت کی تھی اور اس کی وجہ سے اس کا ایک سال بھی خراب ہو گیا تھا۔ مگر اسے اس بات کا کچھ بھی ملال نہیں ہوا تھا۔ پھر ہندو مسلم فسادات میں بھی اس نے پریکٹس چھوڑ کر فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ اور فساد زدوں کی دیکھ بھال کی تھی۔ ناگزیر تھا کہ رضوی اب کے بھی وبا روکنے والی کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے اور وبا زدوں کی دیکھ ریکھ کے لئے کل تیار ہو جاتا۔ مگر اب تک وہ کوئی خاص فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنے اندر ایک کمزوری محسوس کی تھی اور اسے کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے سوچنا پڑ رہا تھا اور اس کمزوری کی وجہ سے وہ اب تک فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا۔

دوست کے خط پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ بوکھلا گیا۔ اس نے خط کو اٹھا لیا اور پڑھنے لگا۔ چند منٹ گزر گئے۔ شاید وہ خط پڑھ بھی چکا تھا۔ مگر اس کی نظریں خط ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ اس میں کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ اس کا دماغ الجھا جا رہا تھا۔ بجلی کا پنکھا گھن گھن کر رہا تھا۔ اور گھڑی ٹک ٹک ٹک ٹک۔

رضوی نے خط کو پھر پیپر ویٹ سے دبا دیا۔ اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں اور چند مہینوں کے واقعات بری طرح گھوم رہے تھے۔ اور اسے اپنے آپ پر قدرے غصہ بھی آ رہا تھا۔ آخر اس نے یہ مکان پسند ہی کیوں کیا تھا۔ مگر اس شہر میں دوسرا مکان ابھی تو ملنا ہی مشکل تھا۔ [illegible] تین کمرے [illegible] خانہ [illegible] مسلمان اور [illegible] ایک [illegible] کو کوئی خاص [illegible] لازم تھا کہ وہ [illegible] جوانی

نہ بڑھاتا۔ اُس نے محض اپنے ساتھ ذمہ داریوں کے بڑھ جانے کے ڈر سے اب تک شادی نہ کی تھی، ورنہ ارادہ تھا۔ لیکن ثریا سے تعلقات بڑھنے کے بعد بھی وہ اپنی زندگی کو بوجھل محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک فطری کمزوری محسوس کرتا تھا۔ یہ کمزوری وقت کے ساتھ ساتھ اُس کا احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اور اُس کی زندگی روز بروز بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ عشق وغیرہ قسم کی چیزوں کا کبھی قائل نہ رہا تھا۔ کالج میں پڑھتے وقت اُس نے رسماً پانچ چھ طالبات سے یکے بعد دیگرے عشق کرنا چاہا تھا۔ لیکن نبھا نہ سکا۔ مگر ثریا کو اکثر نہ دیکھنے پر وہ قدرے بےچین ہو جاتا تھا۔ اور جب ثریا نے اُسے بتایا تھا کہ وہ بھی اُسے دیکھے بغیر بےچین سی رہتی ہے تو وہ اس دن غیر ارادی طور پر ہندستانی فلم دیکھنے چلا گیا تھا۔ اور واپسی پر "رتن" اور "زینت" کے چند ریکارڈ بھی خرید لئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ یہ بلاوجہ کی بےچینیاں اور پریشانیاں کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائیں۔ انھیں دنوں اس نے شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب اُس کی پریشانیاں ختم نہ ہوئیں، تو اس نے ارادہ کر لیا کہ ثریا کو ان باتوں سے آگاہ کر دے اور صاف صاف اپنا خیال ظاہر کر دے کہ وہ ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر عشق یا شاعری کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے نہ ہندستانی فلمیں دیکھنے کے لئے اور نہ اپنی پسند کا ریکارڈ سننے کے لئے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ سن و سال کے تحت اُسے بھی ضرور کچھ دیر کے لئے عورت کی ضرورت ہے۔ مجبوریاً ثریا کی ضرورت نہیں۔ اور اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ ثریا بھی کچھ خاموش خاموش سی رہنے لگی اور کھوئی ہوئی دکھائی دیتی۔ اُس کی عمر بھی اس قابل ہے کہ اسے مرد کی ضرورت ہے۔ رضوی یہ تمام باتیں ثریا کو بتا دینا چاہتا تھا۔ اگر وہ سوچتا تو ضرور کہ آج ثریا آئے تو تمام باتیں کہہ ڈالے۔ مگر جب ثریا آتی تو وہ تمام باتیں بھول جاتا اور اپنی اس بیہودگی پر اُسے از حد نفرت تھی۔ ایک مرتبہ تو وہ ایک بہت ضروری مریض کے ہاں جانے کو تیار تھا۔ کہ ثریا آگئی۔ اور وہ وہاں جانا بھی بھول گیا تھا۔ کسی دن جب ثریا چلی گئی تو اُسے اس بات کا سختی سے احساس ہوا تھا کہ اب اس قصّہ کو بہت جلد ختم کر دینا چاہئے۔ اُسے اس قصّہ کو ختم کرنے کی صورتیں بھی نظر آتی تھیں اور اس وقت اُسے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی اور وہ رک جاتا۔ ....

وہ کرسی سے اُٹھ بیٹھا اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا، مگر اُس کا خیال ماضی کے دھندلکوں میں بھٹک رہا تھا ————— ماضی اور حال ——— ابتدا اور انتہا۔ اُس نے سوچا ——— ابھی انتہا تو ہوئی نہیں ہے۔ اور اُسے یقین تھا کہ انتہا کے بعد یہ پریشانیاں ضرور ختم ہو سکتی تھیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ پیانو پر بیٹھ گیا۔ بےترتیبی سے پیانو پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اُس کی انگلیاں پیانوں کے ریڈ پر چل رہی تھیں مگر اُس کا دماغ اُلجھا ہوا تھا۔ اُسے کلکتہ ضرور جانا چاہئے تھا۔ مگر جب اُس نے ثریا سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا تو ثریا نے اسے اپنی پوری قوت سے کلکتہ جانے سے روکا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ بہت بےتکی بات تھی کہ کوئی جانتے بوجھتے دبا کے مُنہ میں چلا جائے۔ رضوی نے کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور اُسے ان وباؤں سے کبھی ڈرنا نہیں چاہئے۔ اُس نے ثریا کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس [illegible] ضرور [illegible] سکتا ہے۔ وہاں سے گزرنے کے بعد بڑے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اُس کی آنکھوں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نیم [illegible]

[illegible] اندر [illegible]

[illegible] اس کا دماغ پھر

[illegible] ہے؟

[illegible] جو جائے۔

پھر ثریا کو [illegible] کر سکتا ہے [illegible] وہ دماغ پر

کیوں [illegible] نہیں [illegible] کچھ پروا نہ کریگا۔ اور کل صبح اپنے دوست کے ساتھ کلکتہ ضرور چلا جائے گا اور وہاں کورنگ والی کمپنی میں شامل ہو کر نہایت ہی خدمت کرے گا۔ وہ ڈاکٹر ہے۔ اور ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر ہے۔ عاشق یا شاعر نہیں۔ اس کے جانے سے ثریا کو دکھ ہوگا، ہوا کرے، وہ بدل لے گی، مانا کہ وہ ثریا کا کچھ [illegible] تو نہیں......

لیکن اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ محض اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے یہ تمام باتیں سوچ رہا ہے۔ اُسے اعتراف تھا کہ ثریا اس [illegible] بہت بڑی طاقت ہے۔ [illegible] کی شادی کی طرح۔ اور [illegible] جو پیدا ہوا کہ وہ اس طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

آٹھ بج گئے ———

ثریا کا باپ محکمہ جنگلات کا افسر تھا۔ آج صبح ہی وہ دورے پر چلا گیا تھا۔ رضوی کو معلوم تھا کہ آج ثریا ضرور ملنے آئے گی۔ اور وہ اب ثریا کا انتظار بھی کر رہا تھا۔ رضوی نے سوچا کہ [illegible] کا عورت سے اور عورت کا مرد سے کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے۔ اسی لئے تو ثریا نے رضوی کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مگر وہ تو عشق کرنے لگی ہے۔ اور یہ بات بہت عجیب ہے۔ وہ اتنی ناخوش کیوں ہے؟ ——— مگر رضوی ثریا کے متعلق کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا اور ثریا واقعی اس کے لئے ایک معمہ بن کر رہ گئی۔

رضوی اب تک اکتائی ہوئی [illegible] رضوی کے مکان کی پچھلی [illegible] باغ میں کھلتی تھی اور اکثر جب رضوی کا کوئی مہمان بھی، دوست کوئی [illegible] ثریا کے باغ میں [illegible] سکتی تھی۔ اور ثریا بھی اس کے یہاں آ سکتی تھی۔

اب رضوی نے ثریا کے راستے پر نظر گڑا دی۔ اور ثریا [illegible] کا انتظار کرنے لگا

رات بالکل اندھیری ہو گئی تھی۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی بجلی بھی نہیں چمک رہی تھی۔ سامنے ثریا کے کمرے میں جلتی ہوئی بتی کی روشنی بہت [illegible] کھڑکی کے شیشے پر [illegible] جل رہی تھی۔ اچانک بتی بجھ گئی۔

... ثریا کی کھڑکی بند ہو گئی [illegible] کی تاریکی میں رضوی نے دیکھا، ایک سفید سایہ باغ میں حرکت کر رہا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ثریا ہے۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دماغ جیسے [illegible] سخت [illegible] اور سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے خیالات منجمد ہو گئے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو بہت [illegible] کر لیا کہ آج ثریا سے تمام باتیں صاف صاف کہہ دیگا۔ اور اس معاملہ کو یہیں ہی چھوڑ دے گا۔ خواہ کچھ ہو [illegible] پریشانی، بے چینی اور الجھن ہرگز اچھی نہیں ہو سکتی۔

ثریا کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ رضوی نے سلام کیا۔ پھر ثریا کو اندر لانے کے لئے باہر چلا گیا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

اندر آ کر رضوی نے کہا۔۔

"کیوں آج بہت سویرے آ گئیں؟"

ثریا نے کوئی جواب نہیں [illegible] رضوی کے [illegible] خاموش [illegible] کچھ [illegible] رضوی نے اندازہ لگایا [illegible] اور دروازہ بند [illegible] دروازہ بند کر دیا۔ اور [illegible]

کہا۔ مگر وہ خاموش کھڑی رہی۔ رضوی کو قدرے تشویش ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔

"کیا بات ہے، تم بالکل خاموش ہو؟" رضوی نے پوچھا

اب بھی وہ خاموش تھی، صرف اس کے لبوں پر کبھی کبھی بجلی کی طرح مسکراہٹ کی ننھی سی لکیر نمایاں ہو جاتی آج اس نے نیلے رنگ کی ساڑھی اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ نیلے آکاش پر چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ یا پھر نیلے پانیوں میں کنول کا پھول۔ اور سفید بلاؤز میں ابھرا ابھرا سینہ ——— جیسے چاندنی راتوں میں دریا کا مد و جزر ——— اور وہ اپنے اس شاعرانہ تخیل پر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ کیوں کہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر نہیں رہا تھا، بلکہ ایک لذت عاشق، شاعر اور فلسفی ہو گیا تھا

اس نے ثریا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس دن ثریا کے جسم کے چھو جانے سے اس کا روم روم مضطرب ہو اٹھا تھا۔ اور اس کی نس نس میں جیسے طوفان برپا ہو گیا تھا۔ دونوں کوچ پر بیٹھ گئے۔ رضوی نے ثریا کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ دونوں کی نظریں مل گئیں۔ اور رضوی نے محسوس کیا کہ ثریا کی ہمیشہ کی شوخ اور چنچل آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی سنجیدگی اور عجیب طرح کا سکوت تھا۔ اور مجسم ثریا بھی حد درجہ سنجیدہ بنی ہوئی تھی۔ رضوی ثریا میں اس انقلاب پر قدرے حیران بھی تھا۔ وہ دل ہی دل میں ثریا کے نشیب و فراز کا مطالعہ کر رہا تھا۔ آج صبح ہی تو جب ثریا کا بھائی اسکول جا چکا تھا، اور اس کی چھوٹی بہن اور ماں پڑوس میں کہیں گئی تھیں تو ثریا آئی تھی اور رضوی کے ساتھ بہت دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی تھی۔ رضوی نے کہا تھا۔

"مجھے کلکتہ جانا ہی چاہئے ——"

"بہت اچھی بات ہے۔ نیک کام میں دیر کیسی؟" ثریا نے رضوی کی بات کو مذاق سمجھا تھا۔ مگر جب رضوی نے سنجیدگی سے اسے تمام حالات بتلائے تھے اور اپنا خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اسے ضرور ہی جانا ہے۔ تو ثریا قدرے اداس ہو گئی تھی۔ اور نظریں زمین پر جمائے جمائے بیٹھی رہی تھی ——

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ نہ جائیں؟"

"یہ تو میری اپنی بات ہے" رضوی نے کہا تھا۔ "مگر میں خود جانا چاہتا ہوں"

"ہاں آپ کو کیا ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"میں کہتا ہوں، میرے جانے یا نہ جانے سے تمہارا کیا نقصان یا فائدہ ہو سکتا ہے؟" رضوی نے اسے ہلکی سی تھپکی لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ثریا بڑی دیر تک خاموش رہی تھی۔ اور رضوی کی کرسی کے پیچھے کھڑی اس کے بالوں سے کھیلتی رہی تھی پھر رضوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں کھینچ لیا تھا۔ اور ثریا جھپٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھتے رہے تھے۔ پھر اچانک ثریا نے کہا تھا۔

"نہیں —— آپ نہیں جا سکتے ڈاکٹر صاحب"

اور تب رضوی کا چہرہ قدرے اتر گیا تھا، وہ کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ پھر ثریا عجیب شوخی سے اس کے بالوں کو الجھاتی ہوئی بھاگ گئی تھی۔ اور جاتے جاتے کہا تھا —— "آپ نہیں جائیں گے"

رضوی چونک گیا، جیسے اس وقت پھر ثریا نے اس کے بالوں کو الجھا دیا تھا۔ مگر وہ تو خاموش بیٹھی ہوئی گھڑی کو تک رہی تھی جس کا ——— اور کبھی نہ رکنے والا پنڈولم ———

رضوی کوچ سے اٹھا اور پھر کھڑکی میں آکر کھڑا ہو گیا۔ باہر بالکل سکوت تھا۔ واقعی طوفان آنے کو تھا، ثریا بھی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ رضوی نے ثریا کی طرف دیکھا ——— اس کے انگ انگ میں خاموشی تھی۔ سنجیدگی اور سکوت ———

اس نے سوچا شاید اس کی زندگی بھی طوفان کی متلاشی ہے۔ اس کی زندگی میں طوفان آنیوالا ہے اور اس کا جی چاہا کہ وہ ثریا کو

فطرت کے اس اصول سے آگاہ کر دے کہ ہر طوفان کے پہلے سکوت ضروری ہے۔ مگر اس نے ثریا کو فطرت کا یہ اصول بتانے کے بدلے صرف اتنا کہا کہ وہ کل جا رہا ہے۔ ثریا پھر بھی خاموش رہی۔ مگر چند لمحوں کے بعد بولی ——

"کیا واقعی چلے جائیے گا ——"

رضوی نے کہا ——

"چاہتا تو یہی ہوں اور فرض بھی یہی کہتا ہے —— مگر تم کیا کہتی ہو؟"

"میرا کہنا کب کس کام کا ہے؟" ثریا قدرے رندھے ہوئے گلے سے بولی۔

رضوی نے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھائی اور اپنے لب اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے لب آگ کی طرح دہک رہے تھے اور قدرے کپکپا رہے تھے —— پھر ثریا بولی ——

"اگر میرا بس چلے تو آپ کو کبھی نہ جانے دوں"

"لیکن اگر تم ——" رضوی کہنے لگا "حالات پر سنجیدگی سے غور کرو تو شاید میرے نہ کہنے پر بھی تم مجھے زبردستی کلکتہ بھیجو۔"

"وہ کیسے؟" ثریا بولی "یہی نا کہ کلکتہ میں ہزاروں آدمی ہیضہ، چیچک اور پلیگ سے مر رہے ہیں —؟"

"تو کیا یہ بات تمہارے لئے کوئی اہم نہیں؟" رضوی نے حیرت سے پوچھا۔ اب وہ دونوں سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔

"جب انسان، انسان کے لئے وبا تھا تو تیسرے انسان کی کیا چل سکی۔ جواب اس کا مقابلہ کیا جائے جو خدائی قہر ہو" ثریا نے کہا۔

"کیا حماقت ہے،" رضوی ہنسنے لگا —— "تیسرا انسان ہمیشہ ہی کوشش کرتا ہے، اور کوشش بھی کبھی رائیگاں جاتی ہے؟ عجیب احمق ہو تم"

ثریا چپ ہو رہی۔ جیسے اب وہ جواب تلاش کر رہی تھی۔ رضوی پھر بولا —— "میں ایک بات پوچھنے کے لئے بہت دن سے ہمت کر رہا ہوں، مگر ہمت نہیں ہوتی اگر اجازت دو........"

"فرمائیے —" ثریا بولی۔

"تمہارے دل میں میرے متعلق کیسے جذبات ہیں؟"

ثریا چپ رہی۔ اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ رضوی جواب کے انتظار میں اس کی طرف تک رہا تھا۔ مگر ثریا کچھ نہ بولی۔

رضوی ہی بولا "آج تم خلاف معمول بہت سنجیدہ بن گئی ہو؟"

ثریا ہنس دی اور رضوی کا سوال یوں ہی رہ گیا۔ پھر ثریا رک رک کر بولی "عورت کی زندگی میں، ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب وہ بالکل ساکت اور سنجیدہ ہو جاتی ہے"

"شاید طوفان سے پہلے ——" رضوی نے کہا

"نہیں —— کسی ایسے واقعے کے وقوع کے پہلے جس کا پہلے سے گمان تک نہ ہو"

"ہاں، ہاں —— مگر وہ واقعہ طوفان بھی تو ہو سکتا ہے؟"

ثریا چپ ہو گئی۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ رضوی نے کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکا۔ اس نے محسوس کیا کہ طوفان کی آمد ہے اور اب ہوا بھی بہنے لگی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل بڑے زور سے گرج رہے تھے۔ اس نے کہا ——

"باہر دیکھو ثریا ——"

دونوں دور چمکتی ہوئی بجلیوں کو دیکھنے لگے۔

"طوفان آئے گا — —" رضوی نے کہا۔ ثریا خاموش رہی اور رضوی پھر بولا —— "ہر طوفان سے پہلے سکوت ضروری ہے"

"مگر یہ سکوت کے بعد طوفان کا [illegible] ضروری نہیں" ثریا بولی۔

رضوی خاموش تھا۔ ہوا تیز ہوتی گئی۔ پھر بوندا باندی شروع [illegible] ہوا اور تیز ہوتی [illegible] بڑے زور کی ہوا بڑی گرج اور بجلی کی چمک میں آنکھیں [illegible] درخت [illegible] "بڑے زور کا طوفان ہے" اور جب اُس نے ثریا کی طرف دیکھا تو اُس کی شوخ [illegible] آنکھیں [illegible] رضوی [illegible] خوش ہو گیا۔

"ارے تم رو رہی ہو - کیا ہوا؟"

ثریا جیسے [illegible] اور بجلی [illegible] ہوا [illegible] اندر آ رہی تھیں۔ رضوی نے [illegible] اور [illegible] کے ساتھ کوٹ پہن لیا [illegible] ثریا جیسے مدہوش ہوئی جا رہی تھی - [illegible] اُس نے [illegible] ہوئے گلے سے کہا۔

"آپ کلکتہ نہ جایئے ڈاکٹر صاحب" اُس کی آواز میں منت و سماجت [illegible] بھری ہوئی تھی - اور رضوی اُس بات سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اُس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے فیصلہ کر لیا کہ وہ کلکتہ ہرگز نہ جائے گا [illegible] ثریا [illegible] - اُس نے کہا

"اچھا میں بغیر تمہاری مرضی کے ہرگز نہ جاؤں گا لو اب ہنس دو ———"

اُس نے ثریا کو گدگدایا وہ ہنسی کھل کھلا کر ہنسی ——— رضوی نے [illegible] اپنی گود میں دبوچ لیا۔ باہر بڑے زور کی آندھی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی - اندر خنک خنک ہوا آ رہی تھی مگر رضوی کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ثریا کا انگ انگ جل رہا تھا —— اچانک رضوی نے کہا "ایسے طوفان میں ممکن ہے تمہاری امی جاگ جائیں —"

"میں اوپر کے کمرے میں سوتی ہوں" ثریا بولی "اور رات کے وقت میرے کمرے میں کوئی بھی نہیں جاتا"

"چلو پیچھے والے کمرے سے طوفان کا منظر دیکھیں ——" رضوی نے کہا اور دونوں اُٹھ کر پیچھے والے کمرے کی طرف چلے گئے ———————— ! اور جب کافی دیر کے بعد وہ واپس آئے تو طوفان ختم ہو چکا تھا - ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور بڑی لطیف ہوا بہہ رہی تھی - بادل بے ترتیبی سے بھٹک رہے تھے - ایک طرف مدھم سا چاند بھی نکل آیا تھا۔

ثریا اور رضوی کے [illegible] بشاش نظر آ رہے تھے - ثریا کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے اُس کے ہونٹوں سے بھی تبسم کی پھواریں پڑنے لگی ہیں - اور اُس کے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے بال جیسے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے —— اور نیلی ساری میں سلوٹوں کے درمیان اُس کا چہرہ جیسے مدھم سا چاند ——— اور جب وہ اپنے گھر جانے لگی تو رضوی بھی اُس کے ساتھ باہر گیا ——— "اچھا ——— خدا حافظ ——" رضوی نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں ——" ثریا رک کر بولی —— "آپ آئیں گے کب تک؟"

"بس —— دعا کرو کہ وبا جلد ختم ہو جائے اور میں بہت جلد واپس آ سکوں —— خدا حافظ ——"

ثریا اپنی پہلی جیسی شوخی کے ساتھ مڑی اور بولی ———

"خدا حافظ ———" پھر وہ اپنے گھر کے احاطے میں داخل ہو گئی

رضوی نے آسمان کی طرف دیکھا مطلع صاف ہو چکا تھا ———

بیروزگاری اور اُس کا حل

اُردو کا مستقبل

ریڈیائی ڈرامہ

اس بار

جائزے

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے

بدیع مشہدی

بے روزگاری اور اُس کا حل!

بے روزگاری کا مسئلہ اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ اس کا اثر ہر ملک کی آبادی کے ایک کثیر حصہ پر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ اگر حل ہو گیا تو دنیا کے تمام انسان معاشی لحاظ سے فارغ البال ہو جائیں گے اور بھوک، قحط اور فاقہ کشی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اس مسئلہ کی اہمیت ایک اعتبار سے اور بھی زیادہ ہے۔ اس نے دو مجلسی نظام (Social Order) کے فرق کو بہت ہی شدید اور نمایاں طور پر واضح کر دیا ہے۔ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ حکومتوں نے جس طرز سے اس اہم مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ کون سا نظام اس مسئلے کو بہتر طور پر حل کرنے کا اہل ہے۔ مجھے یہاں مثالوں میں زیادہ نہیں پڑنا ہے بلکہ محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی سماج میں انسانی زندگی کی اس اہم ترین گتھی کو سلجھانے کے لئے کون کون سے طریقے بروئے کار لائے جاتے ہیں، اور ان طریقوں میں دونوں کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

مشہور معاشی (Economist) اے۔ سی۔ پیگو (A.C. Pigou) جو اصولی طور پر سرمایہ داری کا حامی ہے، اسے تسلیم کرتا ہے کہ بے روزگاری کا وجود سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بہت بڑی خامی ہے۔ بہت سے مشہور معاشیوں کے خیال میں بے روزگاری ہی سرمایہ دارانہ سماج کی ہولناک ترین برائی ہے جو عام انسانوں کو سرمایہ داری کے خلاف منظم کرتی ہے اور انہیں اشتراکی سماج کی تعمیر پر مجبور کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں بے روزگاری کا مسئلہ محض ایک عارضی مسئلہ ہے لیکن دوسروں کے خیال میں بے روزگاری اور سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے جبتک سرمایہ داری قائم ہے، بے روزگاری کا وجود بھی باقی رہیگا۔ اس کی حیثیت کسی اچانک اور غیر متوقع حادثے کی نہیں۔ اس کی امید اور ڈر تو ہمیشہ ایک خاص وقفہ کے بعد لگا رہتا ہے۔ یہ سرمایہ داری کے دیوالیہ پن کا ثبوت اور اس کے زوال میں مدد دیتا ہے۔ اشتراکیت کے حامیوں کا دعوٰی ہے کہ بے روزگاری نفع کے پہیوں پر چلنے والی معیشت (Economy) کا لازمی نتیجہ ہے اور جبتک سرمایہ داری کا جوا سر پر موجود ہے، بے روزگاری کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا لیکن جیسے ہی اشتراکی معیشت کام کرنا شروع کرتی ہے، اس کا انسداد ہو جاتا ہے۔

بے روزگاری کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ہم ان کا فرداً فرداً جائزہ لیں گے (۱) جب پیداوار میں انتشار اور طلب و رسد (Demand & Supply) کی ہم آہنگی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے تو بے روزگاری پھیلتی ہے۔ انسانی مذاق اور پسند ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ پیداوار کے طریقہ میں جب کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو نئی صنعتیں پرانی صنعتوں کی جگہ لے لیتی ہیں اگر کوئی نئی صنعت اپنی مقابل صنعت کی جگہ لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو آخرالذکر کو زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس میں بے روزگاری پھیلنی شروع ہو جاتی ہے۔ جب لوگوں کی پسند کا رُخ ایک چیز سے ہٹ کر دوسری طرف ہو جاتا ہے تو بے روزگاری پھیلتی ہے۔ جب کوئی صنعت زوال پذیر ہونے لگتی ہے اور اس کی طلب کم ہو جاتی ہے تو اُس کی پیداوار میں بھی کمی شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ مزدوروں کی تخفیف اور بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں زوال پذیر (Declining) صنعت سے ترقی پذیر صنعت کی طرف محنت (Labour) کا پرسکون انتقال نہیں ہونے پاتا۔ وہ معاشی جو بے روزگاری کو محض ایک عارضی چیز سمجھتے ہیں، اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اس طرح کی بے روزگاری سرمایہ دارانہ سماج میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

پیگو کا خیال ہے کہ وہ اسباب جو اس طرح کی بے روزگاری کو جنم دیتے ہیں، اشتراکی سماج میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن کیا ہم اسے تسلیم کرلیں؟

سرمایہ دارانہ سماج میں حکومت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ خالص سرمایہ داری میں سو فیصدی انفرادیت ہوتی ہے۔ پیداوار پر حکومت کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ سرمایہ داروں کو اپنے مفاد اور خواہش کے مطابق سب کچھ کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ منافع کی امید میں وہ پرانی صنعتوں کا خیال نہ کرتے ہوئے، نئی صنعتیں شروع کر سکتے ہیں، اگرچہ ان کے اس اقدام سے بے روزگاری پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔ وہ اس کی ذرا بھی پروا نہیں کریں گے۔

لیکن روس جیسے اشتراکی ملک میں مزدوروں کی بھلائی اور بہبودی کی ذمہ داری براہ راست حکومت پر ہوتی ہے۔ یہاں پیداوار اور اس کی تقسیم حکومت ہی کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔

اگر کسی نئی صنعت سے پرانی صنعت میں بے روزگاری پھیل جانے کا احتمال ہو تو روس کی حکومت اس نئی صنعت کا خیال چھوڑ دے گی۔

اس کے علاوہ بعض اسباب ایسے ہیں جو مزدوروں کے پرسکون انتقال یعنی محنت کی حرکت (Mobility of Labour) کی راہ میں مانع ہوتے ہیں۔

(۱) مزدوروں کی جہالت اور عدم واقفیت۔

(۲) مزدوروں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے فنڈ کی کمی۔

(۳) ٹریننگ کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بھی اس طرح کی بے روزگاری پھیلتی ہے۔ ہر صنعت میں خاص مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) جو لوگ کسی جگہ بس جاتے ہیں، کسی دوسری جگہ جانے کے خواہشمند نہیں ہوتے۔ انھیں اگر وہی کام ملتا رہے جو وہ ہمیشہ کرتے آئے ہیں تو بھی انھیں اپنا گھر چھوڑنا پسند نہیں ہوتا۔ کسی خاص جگہ سے محبت، ان کی محنت کو غیر متحرک (Immobile) بنا دیتا ہے۔

(۵) زبان، اور تمدن کا فرق بھی محنت کو غیر متحرک بنا دیتا ہے۔

یہ دقتیں اشتراکی حکومت میں بھی موجود رہتی ہیں لیکن ان دقتوں کا خاتمہ کرنا حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے۔ محنت کو متحرک رکھنے کے لئے حکومت کوشش کرتی ہے اور اپنے تمام ذرائع سے کام لیتی ہے۔ مزدوروں کو روزگار کے متعلق ہمیشہ تبادلۂ محنت (Labour exchange) کے دفتر سے واقفیت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں مزدوروں کے تمام اخراجات کی کفیل حکومت ہوتی ہے۔ بیکار مزدوروں کو از سر نو تعلیم دینے کا انتظام بھی حکومت کرتی ہے۔

لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں امن و امان قائم رکھنے کے علاوہ حکومت کی اور کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اسے مزدوروں کے مفاد کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ مزدور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ حکومت سے انھیں کوئی مالی امداد نہیں ملتی۔

لہٰذا ان تمام باتوں کے پیش نظر ہم پیگو کے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ اس طرح کی بے روزگاری اشتراکی سماج میں بھی مستقل طور سے موجود رہتی ہے۔ اس لئے پیگو کا یہ خیال کہ جہاں تک اس طرح کی بے روزگاری کا تعلق ہے اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، محض غلط اور بے بنیاد ہے۔ اشتراکیت سرمایہ داری سے کہیں ارفع ہے۔

بے روزگاری کی دوسری قسم وہ ہے جو صنعت کے ڈھانچے میں تبدیلی کے ساتھ عمل میں آتی ہے۔ اس کی نوعیت بھی پہلی بے روزگاری کی سی ہے طلب کے فرق کے ساتھ ساتھ صنعت کے ڈھانچے میں بھی تبدیلی ہوتی ہے، اور اس کا نتیجہ بے روزگاری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) بے روزگاری کی تیسری قسم وہ ہے جو مشین کے روز افزوں استعمال کی وجہ سے پھیلتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں مزدور اپنے آقا سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے منظم ہوتے اور اپنی انجمنیں بناتے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ اجرت میں اضافہ کیا جائے۔ سرمایہ دار مشین کو مزدور کا نعم البدل بنانے کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ مشین انسانی محنت کا کامیاب نعم البدل ہے۔ دوسرے الفاظ میں مشین کا استعمال محنت کی ضرورت کو کم کر دیتا ہے۔ اس لئے جب سرمایہ دار مشین کا استعمال شروع کرتا ہے تو وہ کچھ مزدوروں کو برطرف کر ڈالتا ہے۔

بعض معاشیوں کا خیال ہے کہ اس طرح کی بے روزگاری محض ایک عارضی چیز ہے۔ اس کا اثر دیرپا نہیں ہو سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ مشینوں کے استعمال سے کسی جنس (Commodity.) کی پیداوار کا خرچ گھٹ جائیگا۔ اس لئے لازمی طور پر قیمت بھی گھٹ جائیگی، اور اس جنس کی طلب بڑھ جائیگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پیداوار میں ترقی ہوگی، اور اس طرح وہ تمام مزدور جو مشین کے اچانک استعمال سے بے روزگار ہو گئے تھے، اب پھر برسر روزگار ہو جائیں گے۔

لیکن یہ دلیل قابل قبول نہیں۔ اس دلیل کی بنیاد یہ ہے کہ اگر کسی جنس کی پیداوار کے خرچ میں کمی ہوگی تو اس کی قیمت بھی لازمی طور پر گھٹیگی۔ اور ساتھ ساتھ اس کی طلب میں بھی نمایاں ترقی ہوگی۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ سرمایہ داری میں رقابت (Competition.) کا عنصر موجود ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ سماج میں عملی طور پر آزاد اور مکمل رقابت کا وجود نہیں۔ پیداوار کے تمام شعبوں پر اجارہ داروں (Monopolists.) کا قبضہ ہے۔ اس لئے اگرچہ مشینوں کے استعمال سے پیداوار کا خرچ گھٹ بھی جائے تو بھی یہ اجارہ دار قیمتوں میں کمی نہ ہونے دیں گے۔ بعض اوقات تو پیداوار کے خرچ میں کمی کے ساتھ قیمتیں اور بڑھا دی جاتی ہیں۔ اس لئے طلب بڑھنے کے بجائے اور گھٹ جاتی ہے یا اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ پیداوار کی کمی اور بے روزگاری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے مشین کے استعمال کا اثر سرمایہ دارانہ سماج میں کچھ اچھا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ مشین کی زندگی بھی ایک خاص مدت کی ہوتی ہے جس کے بعد اس سے کام نہیں لیا جا سکتا اس لئے مشین کا استعمال مشین بنانے کی صنعت کو جنم دیتا ہے۔ وہ تمام مزدور جو بے روزگاری کے شکار ہیں اس نئی صنعت میں ان کی کھپت ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی حمایت کا یہ ایک انوکھا طریقہ ہے لیکن یہ دلیل قطعی طور پر تشفی بخش نہیں۔

اس طرح کی بے روزگاری دراصل سرمایہ داری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ بنیادی طور پر طلب رسد (Supply & Demand.) کی ہم آہنگی کا مسئلہ ہے۔ مشین کی روز افزوں طلب (Demand) کے ساتھ محنت کی طلب گھٹتی جاتی ہے لیکن محنت کی رسد اپنی حالت پر رہتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سرمایہ دارانہ سماج میں مزدوروں کی طلب کا تعین سرمایہ دار کرتا ہے۔ اگر وہ مشینوں کی تعداد بڑھانے اور مزدوروں کی تعداد گھٹانے میں نفع دیکھتا ہے، تو اسے اس کا حق حاصل ہے قطع نظر اس سے کہ اس کا اثر عوام پر کیا ہوگا سرمایہ دارانہ حکومت بھی اسے اس طرح کی من مانی کارروائی کی اجازت دیتی ہے، اس کا نتیجہ بے روزگاری کی لعنت ہے۔ لیکن اشتراکی سماج میں پیداوار کی تہ میں نفع کا مقصد نہیں ہوتا۔ اشتراکی معیشت منافع خوری کے بل پر نہیں چلا کرتی۔ یہاں سارا سماج اجتماعی حیثیت سے محنت کی طلب کا تعین کرتا ہے۔ اس لئے یہاں مشین کا استعمال اسی وقت جائز سمجھا جاتا ہے جب

اس سے مزدوروں کو فائدہ پہونچنے کی امید ہو- اس کے برخلاف سرمایہ دارانہ سماج میں چند افراد کے مفاد کا خیال کیا جاتا ہے اور اکثریت کا مفاد قلیت کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے-

(۴) سرمایہ دارانہ سماج میں کبھی تو کاروبار میں بہت ہی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی اس کا دائرہ انتہائی حد تک محدود اور تنگ ہو جاتا ہے- گرم بازاری (Boom) سے سرد بازاری (Slumps) کی طرف اور سرد بازاری سے گرم بازاری کی طرف ـــــ سرمایہ دارانہ سماج میں اس طرح کی حرکت عام ہے-

گرم بازاری کے زمانہ میں خوشحالی کا دور دورہ رہتا ہے، پیداوار میں ترقی ہوتی ہے اور روزگار میں بھی اضافہ ہوتا ہے- سرد بازاری اس کے برعکس ہے- سرد بازاری کا زمانہ بڑی مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے، پیداوار میں کمی ہوتی ہے طلب (Demand) گھٹ جاتی ہے اور بے روزگاری پھیلنے لگتی ہے- سرمایہ دارانہ سماج میں ترقی اور تنزلی کی یہ گردش ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے اس نظام میں گرم بازاری، اور سرد بازاری کے پہیئے ایک چکر کی شکل میں ہمیشہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہتے ہیں- اس حرکت اور گردش کی وجہ سے سرمایہ دارانہ سماج میں بے روزگاری پھیلتی ہے- اس طرح کی بے روزگاری کو (Cyclical Unemployment.) کہتے ہیں- مارکس کا خیال ہے کہ "بے روزگاری سرمایہ داری کے قانون حرکت کا لازمی نتیجہ ہے"

بعض معاشیوں کا خیال ہے کہ جیسے جیسے سرمایہ زیادہ لگایا جاتا ہے، ویسے ویسے پیداوار بھی بڑھتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ روزگار میں بھی اضافہ ہوتا ہے- فرض کیجئے کہ کسی ملک کی قومی آمدنی سو روپیہ ہے- اس میں پچاس روپئے خرچ کر دیئے جاتے ہیں اور پچاس روپئے بچالئے جاتے ہیں- اگر پچاس روپئے کی بچائی ہوئی یہ رقم مزید پیداوار (Production.) میں لگا دی جائے تو بے روزگاری ختم ہو جائے گی- دوسرے الفاظ میں بچت (Saving) ہی بے روزگاری کو جنم دیتی ہے ہمارے صرف کرنے (Consume) کی حد کم و بیش ایک حالت پر رہتی ہے- اس لئے روزگار اور بے روزگاری کا انحصار اس سرمایہ پر ہے جو پیداوار میں لگایا جاتا ہے- سرمایہ منافع کی غرض سے لگایا جاتا ہے- اس لئے سرمایہ دارانہ سماج میں نفع ہی روزگار کا تعین کرتا ہے- نفع بڑھیگا تو روزگار میں بھی اضافہ ہوگا- منافع کی امید کی عدم موجودگی میں سرمایہ کا استعمال بند یا کم زور کر دیا جائیگا- اس لئے زیادہ منافع کا مطلب ہی یہ ہے کہ سرمایہ دار مزید سرمایہ لگائیں گے- اس مزید سرمایہ کا نتیجہ مزید روزگار کی شکل میں ظاہر ہوگا- روزگار کی ترقی عام لوگوں کی آمدنی میں اضافہ کریگی اور لازمی طور پر ان کی قوت خرید (Purchasing Power.) اور صرف کرنے کی صلاحیت بڑھیگی- اس کا اثر سرمایہ کے استعمال پر اچھا پڑیگا- سرمایہ دار پیداوار میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگائیں گے- سرمایہ داری کی اس حرکت کو جو عروج کی طرف ہوتی ہے، اصطلاحی طور پر "گرم بازاری" (Boom.) کہتے ہیں-

اسی لئے کہا گیا ہے کہ سرمایہ داری میں پھیلنے اور بڑھنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے- معاشی نظام ایک بار پھیلنا شروع ہوتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ سرمایہ داری کا یہ پھیلاؤ کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہتا- سرمایہ داری اپنے اندر وسعت کی قدرت تو پیدا کرتی ہے لیکن اس قدرت پر زیادہ دنوں تک اختیار رکھنا اس کے بس کی بات نہیں- ایک مخصوص مدت کے بعد گرم بازاری کی جگہ سرد بازاری لے لیتی ہے

گرم بازاری کے زمانے میں قیمتیں بڑھتی ہیں لیکن مزدوروں کی آمدنی میں اس تناسب سے اضافہ نہیں ہوتا جس سے کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہیں- عام لوگوں کی قوت خرید میں کمی ہوتی ہے لیکن سرمایہ داروں کی قوت خرید (Purchasing Power.) بڑھتی ہے اور ان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے- عام لوگوں کے صرف کرنے کی صلاحیت [illegible] ہوتی ہے- طلب (Demand) میں کوئی زیادتی نہیں ہونے پاتی کیونکہ آمدنی [illegible] (Saving) ہوگی- اس کا اثر پیداوار [illegible]

اور پیداوار کم ہو جائیگی۔ پیداوار کی کمی کی وجہ سے سرمایہ کا استعمال کم ہو جائیگا اور نتیجہ کے طور پر بے روزگاری پھیل جائے گی۔ اس طرح سرد بازاری کا آغاز ہوگا۔

گرم بازاری کاروبار میں حد سے زیادہ وسعت اور اپنے جلو میں سرد بازاری اور معاشی انحطاط لاتی ہے۔ یہ بے روزگاری جو سرد بازاری اور گرم بازاری کی گردش اور حرکت کے باعث وقوع پذیر ہوتی ہے، اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت ہی ہولناک اور تباہ کن ہوتی ہے۔

سرمایہ داری کے حامیوں نے اپنے طور پر اس بے روزگاری کا حل پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں سرمائے کے استعمال کی کمی اور زیادتی ہی روزگار کی کمی اور زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔ صنعتی اتار چڑھاؤ (Industrial Fluctuations.) سرمائے کے استعمال کی کمی اور زیادتی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے اگر سرمائے کے استعمال کو ایک ہی سطح پر ہمیشہ قائم رکھا جائے تو بے روزگاری کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس کے لئے دو صورتیں تجویز کی ہیں۔

(۱) مرکزی بینک کی سود کی شرح (Bank rate policy.) کے ذریعہ۔

(۲) رفاہِ عام (Public Works.) کی پالیسی کے ذریعہ۔

(۱) بازاری سود کی شرح مرکزی بینک (Central Bank.) کی شرح کے تابع ہوتی ہے۔ اگر مرکزی بنک کے سود کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے تو بازاری شرح میں بھی اضافہ ہوگا اور اگر مرکزی بنک کی شرح میں کمی ہوتی ہے تو بازاری سود کی شرح بھی کم ہو جائیگی۔ جہاں تک سود کی شرح کا تعلق ہے، تمام بنک مرکزی بنک کی پیروی کرتے ہیں۔ مرکزی بنک اپنے سود کی شرح بڑھاتا ہے تو دوسرے تمام بنک بھی اپنے سود کی شرح بڑھا دیتے ہیں اور اگر مرکزی بنک اپنی شرح کم کر دیگا تو دوسرے بنک بھی اپنی شرح کم کر دیں گے۔

انسان روپیہ مستعار لیتے وقت دو باتوں کا خیال ضرور رکھتا ہے۔

(۱) سود کی شرح (۲) نفع۔

اگر نفع سود کی شرح سے زیادہ ہے تو سرمائے کا استعمال بڑھ جائیگا۔ برخلاف اس کے اگر سود کی شرح نفع سے زیادہ ہے تو سرمائے کا استعمال کم ہونا شروع ہو جائیگا۔

سرد بازاری (Slumps.) سے بچنے کے لئے سود کی شرح کم رکھنی چاہیئے۔ لیکن گرم بازاری سرمایہ کے حد سے بڑھتے ہوئے استعمال کا نتیجہ ہے۔ گرم بازاری کی حد چونکہ سرد بازاری سے ملی ہوئی ہے، اس لئے حد سے زیادہ وسعت (Ove expansion) سے بچنے کے لئے سود کی شرح میں اضافہ کر دینا چاہیئے۔ لہٰذا ایک خاص سطح تک نفع کی اجازت دینی چاہیئے اور اگر نفع اس سطح سے بڑھنے لگے تو سود کی شرح میں اضافہ کر دینا چاہیئے۔ نفع اگر اس سطح سے نیچے ہو تو سود کی شرح کم کر دینی چاہیئے۔ ان معاشیوں (Economists) کا خیال ہے کہ مرکزی بنک کے سود کی شرح کو مناسب طور پر اور احتیاط کے ساتھ گھٹاتے بڑھاتے رہا جائے تو بے روزگاری کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) سود کی شرح میں تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ رفاہ عام (Public Works) کی پالیسی بھی بہت ضروری ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عامی سرمائے کے استعمال کی کمی اور زیادتی سے اس رنگ برنگی کیفیت اور متلون مزاجی کو ختم کیا جائے جو انفرادی اور ذاتی سرمائے کے استعمال میں پائی جاتی ہے، اور جو دراصل بے روزگاری کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر سرمائے کے استعمال کو ایک سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔ رفاہ عام کا تعلق ان تمام صنعتوں اور پیداواری مہموں (Enterprises) سے ہے جنہیں حکومت اپنے نظم اور سرپرستی سے چلاتی ہے، مثال کے طور پر اسپتال، سڑک، پارک، لائبریری وغیرہ کی تعمیر جو منافع کے اعتبار سے کسی طرح انفرادی نہیں،

عوامی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تعمیر کی ذمہ داری سرمایہ داروں کے سپرد نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان کا مقصد منافع خوری ہے۔ سود کی شرح کے تغیر و تبدل کا اثر سرمائے کے استعمال پر براہِ راست نہیں پڑتا ہے۔ لیکن رفاہِ عام کی پالیسی کا اثر براہِ راست ہوتا ہے، اگر مجموعی سرمائے کے استعمال میں کمی ہو رہی ہو تو حکومت اس کمی کو پورا کریگی۔ جب ذاتی سرمایہ کا استعمال بڑھ رہا ہو تو حکومت کو اپنے سرمائے کا استعمال کم کر دینا چاہیے اور ذاتی سرمایہ کے استعمال میں کمی ہو رہی ہو تو حکومت کو اپنے سرمایہ کا استعمال بڑھا دینا چاہیے۔ اس طریقے سے سرمایہ کے استعمال کو ہمیشہ ایک سطح پر قائم رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں جب سرمایہ کے استعمال میں کمی ہونے لگتی ہے تو معاشی نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے۔

لیکن درحقیقت ان دونوں طریقوں میں سے ایک بھی مکمل طور سے قابلِ عمل نہیں۔ سب سے پہلے ہم "سود کی شرح" کی پالیسی (Bank rate Policy) پر غور کریں۔

سرمائے کے استعمال پر ذہنی اور نفسیاتی رجحانات کا براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ جب عام رجحان تنوطیت یا رجائیت کی طرف ہو تو سود کی شرح سرمایہ کے استعمال پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہتی ہے۔ خفیف سی کمی بے اثر ثابت ہوگی اور زیادہ کمی کا نتیجہ خطرناک ہوگا کیونکہ لوگوں کا اعتماد ختم ہو جائیگا۔ لہٰذا "سود کی شرح" کی پالیسی اس سلسلہ میں کچھ زیادہ مفید نہیں۔

سرمایہ دارانہ سماج میں رفاہِ عام کی پالیسی بھی صنعتی اُتار چڑھاؤ اور اس کی پیدا کی ہوئی بے روزگاری کے حل کی حیثیت سے کامیاب نہیں، اس کی راہ میں بے شمار دشواریاں ہیں۔

عام طور سے قومی سرمائے کا استعمال مجموعی سرمایہ کے مقابلہ میں انتہائی حد تک کم ہوتا ہے۔ انگلستان میں ابھی حال تک اوّل الذکر آخر الذکر کے (۱/۱۰) حصّے سے بھی کم تھا۔

اس کے علاوہ حکومت نے اگر بُرے دنوں میں اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کرکے روزگار بڑھانے کا اضافہ بھی کیا، تو بھی اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکیگا خصوصًا ایسی حالت میں جب کہ اس کی سرگرمیوں سے انفرادی اور ذاتی ملکیت کی صنعتوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی حالت میں جتنا روزگار حکومت اپنی سرگرمیوں سے پیدا کریگی، اسی قدر بے روزگاری ذاتی ملکیت کی صنعتوں میں پھیل جائیگی۔

کسی ملک کی خودمختاری ایک مرکز پر محدود نہیں ہوتی، بلکہ مرکزی حکومت اور بے شمار مقامی اداروں میں بٹی رہتی ہے مرکزی حکومت رفاہِ عام کی پالیسی ان اداروں کے سر زبردستی نہیں تھوپ سکتی۔ علاوہ ازیں عام طور پر ان مقامی اداروں کی مالی حالت اچھی نہیں ہوتی۔ جب آمدنی گھٹتی ہے، تو محصول میں بھی کمی ہوتی ہے اور صوبائی اور مقامی ادارے اپنے سرمایہ کا استعمال کم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مرکزی حکومت ان کے اس اقدام کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے ہوئے بھی، انھیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اس کے برخلاف رفاہِ عام کی پالیسی اشتراکی سماج میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اشتراکی حکومت ذاتی سرمائے کا استعمال ممنوع قرار دیدیتی ہے۔ یہاں کُل سرمایہ قومی ملکیت ہوتا ہے۔ اس لئے قومی اور ذاتی سرمایہ کے مابین کسی تضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ اشتراکی سماج میں لامرکزیت کا وجود نہیں۔ جو راہ مرکزی حکومت اختیار کرتی ہے، وہی راہ مقامی اداروں کو بھی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس بے روزگاری کے ازالے کے لئے بھی جو صنعتی اُتار چڑھاؤ (Industrial Fluctuation) کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، اشتراکیت سرمایہ داری سے بہتر حل پیش کرتی ہے۔

(۵) سرمایہ دارانہ سماج میں مزدوروں کی رسد (Supply) وافر رہتی ہے۔ بہت سے مزدوروں کی اس سماج میں کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور ان کا کوئی مصرف نہیں کیا جاتا۔ لیکن اشتراکی سماج میں ... گاری کبھی کی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف وہاں مزدوروں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ جب کہ سنہ ۱۹۲۹ء سے شروع ہونیوالی سرد بازاری اور معاشی انحطاط کے زمانے میں بھی

سرمایہ دارانہ ممالک میں روزگار کی شدید کمی تھی، روس اس لعنت سے بہت دور تھا۔ وہ بہت سے تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھا۔ پیگو (Pigou.) کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ ممالک بھی اگر اس طرح کی پالیسی پر عمل کرتے تو بے روزگاری کا خاتمہ ہو سکتا تھا لیکن فطری طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب روس بے شمار تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنا تا ہے، امریکہ کیوں اس پالیسی سے گریز کرتا ہے؟ امریکہ کی امکانی قوتیں اور صنعتی صلاحیتیں روس سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جب تک دولت کی تقسیم غیر مساوی ہے، اس وقت تک نہ تو طلب میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ نئی طلب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں طلب (Demand.) کی تخلیق نہیں ہوا کرتی۔

جنگ کا زمانہ عام طور سے بہت ہی مصروفیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بے روزگاری ختم ہو جاتی ہے لیکن سنہ ۱۹۲۵ء میں انگلینڈ میں تقریباً دس ہزار لوگ بیکار تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء انتہائی معاشی عروج کا زمانہ تھا لیکن اس وقت بھی پندرہ لاکھ آدمی بے روزگار تھے۔ اس کے برعکس سوویت روس میں روزگار کی کمی کبھی محسوس نہیں کی گئی۔

اس کی وجہ صاف ہے۔ منافع خوری کا نظام انسانوں کو دو مختلف گروہوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک گروہ جو کل آبادی کا محض ایک حقیر حصہ ہوتا ہے، تمام ذرائع پیداوار کا مالک ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کا ملک کی معیشت اور پیداوار پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

مزدوروں کے اس گروہ کی حیثیت ایک جنس (Commodity) سے زیادہ نہیں۔ کسی جنس کی طرح مزدور اپنی محنت کو اجرت کے عوض بیچتے ہیں۔ مزدور اپنی محنت سے قدر (Value.) پیدا کرتے ہیں لیکن انھیں جو اجرت ملتی ہے وہ اس قدر کا محض ایک حصہ ہوتی ہے۔ بقیہ تمام قدر نفع کی شکل میں سرمایہ داروں کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ آمدنی کا تفاوت بڑھتا ہے۔ اور بچت (Saving.) میں ترقی ہوتی ہے۔ اس لئے طلب میں کوئی اضافہ نہیں ہونے پاتا۔ اور اس کا نتیجہ روزگار کی کمی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر حکومت بے روزگاری دور کرنے کے لئے قدم بھی اٹھاتی ہے تو سرمایہ دار اس کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں۔ یہی سرمایہ داروں نے روزویلٹ کے تعمیر نو کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا کیونکہ اس سے ان کی منافع خوری کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ سرمایہ دارانہ معیشت اور بے روزگاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لارڈ کینس (Lord Keynes) اور اس کے ہم خیال معاشیوں نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں بے روزگاری ختم کی جا سکتی ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ بے روزگاری کی اصلی وجہ بااثر طلب (Effective Demand.) کا فقدان ہے۔ بااثر طلب سے مراد ایسی طلب ہے جس کی پشت پر قوت خرید (Purchasing Power.) بھی موجود ہو۔ حکومت بااثر طلب کی تخلیق کر سکتی ہے۔ انھوں نے اس کی دو صورتیں بتائی ہیں۔

(۱) خسارے کے بجٹ کے ذریعہ (۲) ترقی پذیر محصول کے ذریعہ۔ کینس کی رائے ہے کہ حکومت کو خسارے کا بجٹ بنانا چاہئے۔ اس سے عام لوگوں کے پاس معاشی انحطاط کے زمانے میں خرچ کرنے کے لئے زیادہ روپے بچے رہیں گے۔ حکومت کو آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا چاہئے۔ بے روزگاری کا انحصار خرچ پر ہے کیونکہ بااثر طلب کا تعلق براہ راست خرچ سے ہے۔ اگر کل بچت پیداوار میں لگا دی جاتی ہے تو کل خرچ آمدنی کے برابر ہو جائیگا۔ اگر کل بچت نہیں لگائی جاتی ہے تو کل طلب میں کمی واقع ہوگی۔ لہذا قیمت گر جائے گی نفع غائب ہو نا شروع ہو جائیگا، پیداوار گھٹ جائیگی اور بے روزگاری پھیلنے لگے گی۔ اس لئے بچت کا مسئلہ دراصل بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ مگر بچت کسی صورت سے خرچ کر دی جاتی ہے تو بے روزگاری ختم ہو جائیگی اور یہ صرف خسارے کے بجٹ ہی سے ممکن ہے۔

حکومت اگر خسارے کے بجٹ کی پالیسی پر عمل کرتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہوگا۔ خرچ کی یہ زائد رقم قرض سے [illegible] جاتی ہے۔ قرض کی یہ رقم جو [illegible] ہے، لوگوں کے پاس بیکار پڑی رہتی تھی۔ حکومت کے ذریعہ خرچ کی جاتی ہے اور قرض

پھر عام لوگوں کے پاس پہونچ جاتی ہے۔ اس طرح حکومت کُل بچت کو جو افراد کے پاس بیکار پڑی رہتی ہے، قرض کی صورت میں لے لیتی ہے اور خرچ کے ذریعہ اسے پھر عام لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتی ہے۔ اس صورت سے خسارے کا بجٹ (Deficit Budget.) کُل طلب کے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(۲) ترقی پذیر محصول (Progressive Texation.) بے روزگاری کی بیخ کنی کا دوسرا ڈھب ہے۔ اگر کُل بچت پیداوار میں لگا دی جائے تو طلب میں کوئی کمی نہ ہوگی لیکن سرمایہ داری میں ایسا کم ہوتا ہے۔ منافع کی کمی کے ساتھ بچت کا استعمال بھی بند ہو جاتا ہے۔ بچت بے مصرف حالت پر پڑی رہتی ہے۔ اس طرح بچت کُل طلب پر مُضر طور سے اثر انداز ہوتی ہے۔

بچت دولتمند طبقہ ہی کرتا ہے۔ اس کے پاس بے انتہا روپے ہوتے ہیں اور روپے کا افادۂ لب (Marginal Utility.) بھی ان کے لئے کم رہتا ہے۔ غریب لوگوں کو عام طور سے بچت کا موقع نہیں ملتا۔ ترقی پذیر محصول کے ذریعہ حکومت دولتمند طبقے کی بچائی ہوئی رقم کو اپنے قبضہ میں کر سکتی ہے۔ ترقی پذیر محصول کا اطلاق بچت پر ہوتا ہے نہ کہ خرچ پر۔ اگر بچت کی یہ رقم امیروں سے کر غریب لوگوں تک منتقل کر دی جائے تو لازمی طور پر غریبوں کی آمدنی بڑھیگی۔ آمدنی کا اضافہ ان کی قوت خرید کو بڑھائیگا اور صرف کرنے کی صلاحیت میں ترقی ہوگی۔ اس کا اثر براہ راست پیداوار پر پڑیگا۔ پیداوار بڑھیگی اور بے روزگاری کم ہو جائیگی۔ ترقی پذیر محصول کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) ترقی پذیر محصول آمدنی (Progressive Income-tax.)

(۲) موت کا محصول (Death Duty.)

حکومت کو حتی الوسع بالواسطہ محصول (Indirect Tex) سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ اس کا بوجھ آخر میں صرف کرنے والوں یعنی عام لوگوں پر پڑتا ہے۔ اس سے قیمت بڑھتی اور طلب کم ہو جاتی ہے۔ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے بہت پست ہے۔

لیکن سرمایہ دارانہ سماج میں یہ دونوں صورتیں بھی کچھ زیادہ قابل عمل نہیں۔ ذاتی سرمائے کا استعمال نفع کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ زیادہ محصول لگایا جائیگا تو نفع میں کمی ہوگی۔ سرمایہ دار منافع میں کمی دیکھ کر سرمائے کا استعمال کم کرنا شروع کر دیں گے۔ پیداوار گھٹ جائیگی اور بے روزگاری پھیلنے لگے گی۔ اس لئے ترقی پذیر محصول اور اس کے اثر کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کا اثر الٹا ہوتا ہے اس لحاظ سے خسارے کے بجٹ کی پالیسی ایک حد تک زیادہ مفید ہے۔ لیکن یہ بھی سرمایہ دارانہ سماج سے بے روزگاری کی بیخ کنی مکمل طور سے نہیں کر سکتی۔

سرمایہ داری کی موجودگی میں بے روزگاری کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سی ایسی عملی دشواریاں ہیں جو سرمایہ دارانہ سماج میں بے روزگاری کو ناگزیر بنا دیتی ہیں۔ سرمایہ دار اسے کبھی منظور نہیں کر سکتے کہ بے روزگاری کا خاتمہ ہو جائے۔ مکمل روزگار (Full employment.) کی پالیسی ہی میں ایک طرح کا تضاد پایا جاتا ہے۔ مکمل روزگار مزدور طبقہ کی طاقت کو بڑھاتا اور سرمایہ دار طبقہ کو کمزور کرتا ہے۔ مزدور زیادہ اجرت کا مطالبہ کریں گے۔ مکمل روزگار کی حالت میں سرمایہ دار مزدوروں کے تمام مطالبات ماننے پر مجبور ہوں گے۔ اس طرح آخر میں اشتراکیت ناگزیر ہو جائیگی اور مزدور حکومت کی مشین پر قابض ہو جائیں گے اس لئے نظری اعتبار سے کینس جو کچھ کہتا ہے، صحیح ہے لیکن عملی طور پر اس کی اہمیت ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں۔

مکمل روزگار کی حالت میں ”سیاہ قدموں“ (Black-Legs) کا وجود مٹ جائیگا۔ سرمایہ دارانہ سماج میں ہمیشہ بے روزگاروں کی ایک فوج موجود رہتی ہے۔ مزدور جب اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کرتے ہیں، تو سرمایہ دار انھیں شکست دینے اور ہڑتال کو ناکام بنانے کے لئے اس فوج کا مدد لیتے ہیں۔ بیکار مزدور جو ہڑتال پر گئے ہوئے مزدوروں کی جگہ پر

بحال کئے جاتے ہیں۔ انہیں (Black Legs) کہتے ہیں۔ مکمل روزگار کی حالت میں سرمایہ داروں سے یہ ہتھیار چھن جائیگا سرمایہ داروں کی طاقت مزدوروں کے مقابلہ میں بہت کم ہو جائیگی۔

گرچہ جنس سرمایہ دارانہ ممالک میں بالغ رائے دہندگی (Adult Franchise) رواج پاگئی ہے، لیکن ہمہ مگہ بوجود مکمل روزگار کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔ وہاں بھی مزدور سرمایہ دار کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح رہتے ہیں۔ سرمایہ دار ان کے خیالات پر پورا پورا اختیار رکھتے ہیں اور انھیں اپنی موافقت میں ووٹ دینے پر مجبور کرتے ہیں۔

ایک بار جیسے ہی مکمل روزگار وجود میں آجاتا ہے، مزدوروں کی معاشی آزادی (Economic Independence) مکمل ہوجاتی ہے۔ معاشی طور پر خوشحال ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ہی نمائندوں کو ووٹ دیں گے۔ سرمایہ دار انھیں اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے میں ناکام رہیں گے۔ سرمایہ داروں کو اس خطرے کا احساس ہے اور اسی لئے وہ ہمیشہ مکمل روزگار کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ امریکہ میں ٹرومین (Truman) امریکی معاشی نظام پر سے کنٹرول اٹھانے (De-control) کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ اس کا یہ اقدام مکمل روزگار کی پالیسی کو ناکام بنانے کے لئے ہے۔ لیکن اس کے برعکس مشرقی یورپ کی نئی جمہوریتوں میں جہاں کہ محنت کش طبقہ کی حکومت ہے، مکمل روزگار کی پالیسی پر بلا روک ٹوک عمل کیا جا رہا ہے اس لئے ایک اشتراکی سماج ہی میں مکمل روزگار کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ اشتراکیت میں سرمایہ اور زمین، دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم پر سارے سماج کا قبضہ رہتا ہے یہاں ذاتی سرمایہ اور منافع کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دولت کی تقسیم بھی مساوی ہے۔ ۔۔۔لئے لوگوں کی آمدنی میں غیر ہمواری نہیں پائی جاتی۔ بے روزگاری آمدنی کی ناہمواری کا لازمی نتیجہ ہے، اس لئے اشتراکیت میں بے روزگاری کا امکان ہی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ سرمایہ داری میں معاشی سکون اور اطمینان کا وجود نہیں۔ حکومت مصیبت زدہ افراد کی کوئی مدد نہیں کرتی۔ کوئی فرد اپنے مستقبل کی طرف سے مطمئن نہیں رہتا۔ مستقبل کی طرف سے یہ بے اطمینانی اُسے بچت کرنے پر مجبور کرتی ہے جس کا لازمی نتیجہ بے روزگاری ہے۔ لیکن اشتراکی سماج میں مستقبل کی فکر کسی کو بھی پریشان نہیں کرتی۔ حکومت تمام افراد کی معاشی خوشحالی کی ضامن ہوتی ہے۔ افراد اپنے مستقبل کو حکومت کے ہاتھوں میں محفوظ سمجھتے ہیں اور انھیں بچت (Saving) کی ضرورت ہی لاحق نہیں۔ اس طرح سے اشتراکیت میں بے روزگاری کا سرچشمہ ہی خشک ہو جاتا ہے۔

انیس الرحمٰن

اُردو کا مستقبل

...... یہ بالکل صحیح بات ہے کہ اُردو ختم ہو جائے گی، اور یہ چیز مسٹ کر رہے گی، اور اب مسٹ بربادی سے بچنا محال ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اس بربادی کا یہی سبب نہ ہو گا کہ پنت جی نے اسے منظور نہ کیا، یا ہندیونین نے اسے نہ مانا۔ بلکہ اگر ہند یونین اور ہندستان کی ساری صوبائی حکومتیں بھی اسے سرکاری زبان مان لیں، تو بھی یہ مٹ کر رہے گی۔ کیونکہ ہم خود اسے ترک کر دیں گے یعنی اردو کے اخبار نویس اسے ترک کر دیں گے۔ اگر پنڈت پنت جی کو اُردو کو زندہ رکھنا ہے تو اپنے شہروں میں رکھیں ہم اب اس لاش کو زیادہ دنوں تک نہیں ڈھو سکتے۔ اُردو کیوں مٹ جائیگی، اور خود اس کے ناشر اور اخبار نویس کیوں اسے ترک کر دیں گے یہی وہ بات ہے، جسے آپ کے گوش گذار کرنے کے لئے ہم نے آج قلم اٹھایا ہے۔ شاید یہ کہنے کی آپ سے کسی نے جرأت نہ کی ہو گی۔

اُردو اگر ختم ہو گی تو محض دو سبب کی بنا پر ختم ہو گی۔

(۱) اپنے ناقص رسم خط کی وجہ سے اور

(۲) اُردو دانوں کی ناقدر دانی کے سبب سے۔

اب اس دروغ مصلحت آمیز کو ہم زیادہ دنوں تک نہیں نباہ سکتے کہ فارسی رسم خط بہت عمدہ رسم خط ہے۔ بڑے بڑے ملا یہ چیز ثابت کرنے میں اپنا زور قلم صرف کر دیتے ہیں اور علم کے دریا بہا دیتے ہیں کہ فارسی رسم خط دنیا کا سب سے حسین اور سائنٹیفک رسم خط ہے۔ اس کے حسین ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے، لیکن اسے سائنٹیفک کہنا ایک فریب ہے۔ اردو رسم خط کیسا ہے یہ کوئی ہم اخبار نویسوں اور پبلشروں سے پوچھے کس سے ——— یا اخبار کا ایک ایشو نکالنے میں اس طرح جوئے شیر لانا پڑتا ہے کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، اور جب وہ ایشو شائع ہو جاتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ مر کر دوبارہ پیدا ہوئے۔

اُردو کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس کا ٹائپ موجود نہیں جس کے سبب اس کی طباعت میں ہزاروں قسم کی دقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیتھو کی چھپائی عمدہ نہیں ہوتی۔ متن کے ساتھ ساتھ تصویریں نہیں چھپ سکتیں، اشتہارات میں بھی چونکہ تصویریں یا ڈیزائن ہوتے ہیں، اس لئے اشتہارات اچھے نہیں چھپ سکتے۔ اچھے کاتبوں کا ملنا دشوار ہے۔ اردو کاتبوں کا خط آپس میں نہیں ملتا جس سے یکسانیت باقی نہیں رہتی۔ اخبارات رسالے یا کتابیں تھوڑے وقت میں نہیں نکل سکتیں وغیرہ وغیرہ۔

فرض کیجیے آپ کو انگریزی یا ہندی کی ۵۰۰ سو صفحات کی کوئی کتاب ایک دن میں شائع کرنی ہے تو آپ یقیناً شائع کر سکتے ہیں ایک بڑا پریس اپنا سارا اسٹاف لگا کر یہ کتاب ایک دن میں شائع کر سکتا ہے۔ لیکن اُردو کی کوئی کتاب آپ اس قدر جلد یا اس سے دوگونے یا چار گونے وقت میں بھی شائع نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑی دقت کتابت کی ہو گی۔ ایک کاتب زیادہ سے زیادہ ۶ صفحے ایک دن میں لکھ سکے گا یعنی ۸۵ دن محض کتابت کے لئے چاہئیں۔ اگر ایک سے زیادہ کاتب اس کام میں لگائیں گے تو ان کے خطوں میں اس قدر تفاوت پیدا ہو جائیگا کہ کتاب چوں چوں کا مربہ بن جائیگی۔ علاوہ اس کے پچیس کاتب کسی ایک شہر میں جلدی نہ مہیا ہو سکیں گے جو سولہ سولہ صفحات لکھ کر دن میں یہ کام پورا کر دیں۔ پھر اگر اس کام کو کم از کم وقت میں کرانا ہے تو ایسے [illegible] کاتب ڈھونڈنے ہوں گے، جن کا خط ایک سا ہو۔ لیکن برخلاف اس کے اگر ہندی یا انگریزی میں کتاب چھپانی ہو تو چار پانچ لینوٹائپ [illegible] کمپوزیٹر کا کام کرتا ہے، وقف کر دیے جائیں، تو [illegible] گھنٹوں کے اندر پانچ سو صفحات کی یہ کتاب کمپوز ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد چھپائی [illegible]

آٹھ ہزار کی تعداد میں چھپتی ہے۔ تو اگر لیتھو کی دو مشینیں بھی اس کے لئے وقف کر دی جائیں، تو یہ ۲۵ فارم (۱۶ صفحات کا ایک فارم ہوتا ہے) کی ایک کتاب ۲۵ دنوں میں چھپ کر تیار ہو سکے گی یعنی اتوار اور تعطیلات کو ملنے کے بعد ایک ماہ میں اس کی کتابت ہو سکے گی، اور ایک ماہ میں یہ چھپ کر تیار ہوگی۔ لیتھو پرنٹنگ مشین کی اوسط رفتار آٹھ گھنٹوں میں ۴ ہزار کا فارم روزانہ ہے۔ لیکن یہی کتاب اگر ٹائپ میں ہو تو دو روٹیری مشینوں پر جس کی رفتار ۷-۸ ہزار فی گھنٹہ ہے، ۲۴ گھنٹوں کے اندر چھپ کر تیار ہو سکتی ہے۔

روٹری، ریڈیو اور جوہری بم کے اس دور میں ہماری سست رفتاری کا یہ عالم ہے۔ ہمارا دعوٰی ہے کہ اگر کسی روزنامہ اردو اخبار کی اشاعت ۵۰ ہزار ہو تو وہ نکل ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر غیر معمولی کوشش کی جائے تو یہ روزنامہ اخبار تین دنوں میں نکل سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی روزنامہ اردو اخبار کی اشاعت دس ہزار ہے اور چار صفحوں پر نکلتا ہے تو اس کے صرف دو ہی صفحات لیتھو مشین پر چھپ سکتے ہیں لہذا اس کی چھپائی کے لئے دو مشینیں وقف کر دینی پڑیں گی اور مشینیں اگر بڑی چلائیں کہ گھنٹے میں ایک ہزار چھاپ دیں تو اس اخبار کی چھپائی میں دس گھنٹے لگیں گے یعنی اگر ۶ بجے صبح کو اخبار نکلنا ہے تو ۶ بجے شام ہی کو یعنی بارہ گھنٹے قبل آپ کو اخبار پریس میں بھیج دینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو اخبار ۶ بجے شام کو چھپنے چلا جائے تو اس میں تازہ خبریں کہاں سے آئیں گی۔ اور اس میں ۶ بجے شام تک ہی کی خبریں ہونگی۔ خبریں تو زیادہ تر رات کے ۹ بجے کے بعد ہی آیا کرتی ہیں۔ اس لئے یہ اردو اخبار تمام تازہ خبروں سے محروم ہوگا۔ ہاں اگر یہ اخبار ایک ہزار چھپتا تو یقینی اس میں ۳-۴ بجے شب تک کی خبریں مل سکتی ہیں۔ آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر اردو کے اتنے سارے روزنامے کس طرح نکلتے ہیں تو بے ادبی معاف ہو کہ زیادہ تر اردو اخبارات کا یعنی ۵۰ فیصدی کا یہی حال ہے کہ ان کی اشاعت ایک ہزار سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر یہ اخبار انگریزی کا یا ہندی کا ہو تو وہ بڑے آرام سے ۴ بجے تک کی خبریں لے سکتا ہے، اور روٹری پر آدھے گھنٹے کے اندر دس ہزار اخبار چھپ سکتا ہے۔ کیونکہ اخبار چھاپنے والی روٹری کی رفتار ۱۵-۲۰ ہزار فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

اتنا ہی نہیں اردو اخبارات کے ساتھ ایک اور مصیبت ترجمہ کی بھی ہے۔ جتنی خبریں آتی ہیں، وہ انگریزی میں آیا کرتی ہیں، اور ان کا اردو میں ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ میں کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ لہذا ترجمے کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ اس اخبار میں ۴ بجے دن سے آگے کی خبریں نہیں لے سکتے۔ ترجمے کی دقت ہندی اخباروں کو بھی ہے لیکن انھوں نے ہندی کا ٹیلی پرنٹر بنا لیا ہے، اور اب ٹیلی پرنٹر پر براہ راست ہندی میں خبریں آیا کریں گی۔ یونائیٹڈ پریس نے اس کا انتظام کر لیا ہے

تقریباً چار پانچسو روپیہ ماہوار ہر اردو اخبار مترجمین کی تنخواہوں پر ضائع کرتا ہے۔ اور عموماً مترجمین آٹھویں جماعت تک پڑھے ہوتے ہیں، جو خبروں کو سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ لہذا وہ اپنی قابلیت کا اظہار عموماً اشتعال انگیز اور جذباتی سرخیاں لگا کر کیا کرتے ہیں۔ اردو کی ترقی کی اس قدر طوفانی تحریکیں چلیں اور ان لوگوں نے لاکھوں روپئے پبلک کے برباد کئے لیکن انھیں اتنی توفیق نہ ہوئی کہ یہ تعمیری کام انجام دیتے اور کسی مرکزی مقام سے ہندستان کے تمام اردو اخباروں کو ترجمہ شدہ خبریں، رومن میں ٹیلی پرنٹر پر بھجوانے کا انتظام کرتے اور کاتب اس بات کی عادت ڈال لیتے کہ براہ راست رومن سے کتابت کر لیا کریں۔ اس طرح ہر اردو اخبار جلد نکل سکتا، اور ہر اخبار کے سیکڑوں روپئے ماہوار مترجمین کی تنخواہوں کے بچ جاتے۔ اتنا ہی نہیں، مرکزی ادارے میں قابل مترجم رکھے جاتے، اور اخبار بینوں کو خبروں کا صحیح ترجمہ مل جایا کرتا۔ لیکن اس قوم کے اندر سوائے جذباتی ہنگاموں کے ہے کیا۔ تعمیری کام کرنیوالوں کی کون قدر کرتا ہے۔ انجمن ترقی اردو بیس سال تک اردو کی ترقی کا نعرہ لگاتی رہی اور اردو کا جھنڈا اٹھائے ٹہلتے پھری، اور اس کے ذریعہ چند لوگوں نے لیڈری بھی حاصل کرلی، اور قوم کے لاکھوں روپئے برباد بھی کئے گئے۔ لیکن جو کام کرنیکا تھا وہ نہ کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو خود ہی کتابیں چھاپنے اور اخبار نکالنے کے مرض میں مبتلا ہو گئی، حالانکہ اصل کام اردو کی چھپائی کی دقتوں کو دور کرنا، اور اخباروں اور پبلشروں کو سہولتیں بہم پہنچانا تھا۔ اسے اردو کا ٹائپ ایجاد کرنا تھا، لینو ٹائپ مشین ڈھلوانی تھی، مونو ٹائپ مشین ڈھلوانی تھی، اردو کا ٹیلی پرنٹر بنانا تھا، اور اردو کا ٹائپ رائٹر ایجاد کرنا تھا، لیتھو کا ٹریڈل ڈھلوانا تھا۔ لیکن

وہ ٹائپ کیا ایجاد کریں گے، انھوں نے خود عوام کی مخالفت سے ڈر کر اپنا اخبار ٹائپ کے بدلے نستعلیق میں کر دیا۔ اگر پبلک اُردو ٹائپ کو
پسند نہیں کرتی تو انھیں خسارے کا کیا خطرہ تھا، کیونکہ ان کو فنڈ تو چندہ سے آتا تھا وہ خسارہ دیتے رہتے اور ٹائپ ہی میں چھاپتے، حتیٰ
تا وقتیکہ ٹائپ مقبول نہ ہو جاتا۔ اگر ہمارے جیسے پرائیویٹ ادارے، جنھوں نے اپنی ذاتی پونجی اخبار پر لگا رکھی ہے، ٹائپ میں چھاپنے
سے ڈریں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔

لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ یورپ، امریکہ اور روس کے روزنامے جن کی اشاعت لاکھوں تک پہنچتی ہے، وہ کس طرح
چھپتے ہوں گے۔ ڈیلی ہیرالڈ لندن کی اشاعت ۲۶ لاکھ روزانہ ہے۔ آخر یہ اخبار روز آنہ کس طرح دو گھنٹوں کے اندر چھپ کر مارکیٹ
میں آ جاتا ہے۔ ۳ بجے رات تک کی خبر لیکر یہ روزنامہ دو گھنٹوں کے اندر یعنی پانچ بجے صبح تک نکل جاتا ہے۔ ایک نئی مشین صرف
روزانہ اخبارات چھاپنے کی ایجاد ہوئی ہے، جو گھنٹے میں پچاس ہزار کاپیاں چھاپتی ہے۔ اس کی قیمت دس لاکھ روپے ہے لیکن
یہ مشین بھی دو گھنٹوں کے اندر ایک لاکھ کاپیاں ہی چھاپ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کی پچاس روٹری مشین ڈیلی
ہیرالڈ کے چھاپنے کے لئے درکار ہوں گی۔

غرضکہ آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُردو اخبارات کی اشاعت کبھی ایک لاکھ بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اور اگر پہنچ جائے تو
ہم اس کی چھپائی کا انتظام بھی نہیں کر سکتے۔ لیتھو کی چھپائی میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ پانچ ہزار داب کے بعد اس کے حروف پتھر
سے اڑنے لگتے ہیں اور اسے بار بار کاتب کو پتھر پر دوبارہ (Re.touch) کرنا پڑتا ہے۔ منحنی و نازک سی گوند کی اس بیچاری
لکیر کا کیا بھروسہ۔ ابھی ہے، ابھی نہیں۔ ٹائپ کی طرح وہ کوئی دھات کی ٹھوس چیز تو ہے نہیں کہ طاقتور مشین کے رگڑوں کی تاب
لا سکے۔ لیکن پچاس ہزار داب کے بعد ٹائپ بھی اپنی تازگی اور نوک پلک کھو بیٹھتے ہیں۔ اس لئے اچھے پریسوں میں کسی ٹائپ کو
ایک بار چھاپ لینے کے بعد دوبارہ استعمال نہیں کیا جاتا ایک بار، دس بیس ہزار یا پچاس ہزار داب کا ایک کام چھاپ لینے کے بعد یہ
ٹائپ گلا دیئے جاتے ہیں، اور اسی دھات سے دوسرے تازہ ٹائپ ڈھال لئے جاتے ہیں۔

لیکن گھنٹے میں پچاس ہزار چھاپنے والی مشین کی تیز رفتاری کی تاب یہ ٹائپ بھی نہیں لا سکتے۔ کیونکہ ہر ٹائپ فرداً فرداً
الگ ہوتا ہے اور مشین کے طوفانی جھونکوں میں جہاں ایک ٹائپ الگ ہوا، اور اِدھر سے اُدھر ہوا اور سارا انتظام درہم برہم ہوا۔
علاوہ ازیں، ایک ٹائپ دس پانچ لاکھ داب میں اتنا گھس جائیگا کہ بالکل بیکار ہو جائیگا۔ اسی لئے بڑے بڑے ڈیلی اخبارات
ٹائپ سے نہیں چھپتے۔ بلکہ مضامین کو لینو ٹائپ پر کمپوز کرا کے موٹی دفتیں، یعنی کارڈ بورڈ پر اس کی داب لے لیتے ہیں اور اس طرح
اخبار کے سائز کا ایک سانچہ تیار ہو جاتا ہے پھر اس سانچے پر سیسہ ڈالکر ایک پوری سیسے کی شیٹ ڈھال لیتے ہیں۔ جو اخبار کے تختہ
کی ہوتی ہے اور اسی شیٹ پر تمام حروف اُبھرے ہوتے ہیں۔ پھر اس شیٹ کو مشین کے سلنڈر کے گرد لپیٹ دیتے ہیں اور سلنڈر
تیز رفتاری سے گھومتا جاتا ہے، اور کاپیاں چھپتی جاتی ہیں۔ اس مشین میں کاغذ الگ سے لگایا نہیں جاتا۔ کیونکہ اس تیز رفتار مشین
کو کاغذ سپلائی کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے دھاگے کی ریل کی طرح کاغذ ایک رول کے گرد لپٹا ہوتا ہے اور مشین کے
ساتھ ساتھ یہ رول پھر پھر کر مشین کو کاغذ سپلائی کرتا رہتا ہے، جس طرح سلائی کی مشین کو ریل دھاگہ سپلائی کرتی رہتی ہے۔
اخبار چھاپنے والی مشین خود ہی کاغذ کو کاٹتی اور موڑتی جاتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ۲۶ لاکھ اخبارات کو محض موڑنے کے
لئے ایک ہفتہ درکار ہو۔

بہرحال غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارا اُردو پریس اس تیز رفتاری کی تاب لا سکتا ہے؟ اور اگر نہیں لا سکتا تو پھر
اُردو کا کیا مستقبل ہے؟۔ ہاں اگر ہم بجائے نستعلیق کے ٹائپ استعمال کریں تو اس کا بھی سانچہ بنا کر ہم پوری شیٹ ڈھال سکتے ہیں
اور پچاس ہزار کی رفتار والی روٹری کو استعمال میں لا کر اپنا اخبار لاکھوں کی تعداد میں چھاپ سکتے ہیں جس طرح مصر کے عربی اخبارات ـ

عشق ہو گیا ہے کہ آپ ٹائپ کے حروف پڑھنا نہیں چاہتے۔ اب صورتیں صرف تین باقی رہ جاتی ہیں۔ (۱) یا تو قوم کروڑ دو کروڑ روپے صرف کر کے نستعلیق کو ٹائپ ڈھلوا سکے (۲) یا رومن رسم خط کو اختیار کرے اور (۳) اگر یہ بھی نہیں کرتی تو ٹنڈن جی ٹھیک کہتے ہیں، ناگری رسم خط اختیار کرے۔ اس کے سوا چوتھی صورت موجود نہیں۔ ہاں ایک صورت اور بھی ہے یعنی موجودہ نستعلیق ہی کو برقرار رکھا جائے لیکن اس صورت میں ہم تمام اُردو کے اخبار نویس اور ناشر قوم سے رخصت کی اجازت چاہیں گے تاکہ اُردو کے ساتھ ہم اپنا، اور اپنے بچوں کا مستقبل خراب نہ کریں۔ اگر آپ کو نستعلیق اس قدر محبوب ہے تو بڑے بڑے طغرے لکھوا کر اپنے کمروں میں آویزاں کیجئے، اور صبح شام اُن پر پھولوں کا ہار ڈالئے، یا اگر عشق حد سے زیادہ گزر گیا ہے تو شہد لگا کر اسے چاٹا کیجئے۔ لیکن ہماری جان بخشی کیجئے۔ ہم عنقریب اُردو کے اخبار نویسوں اور ناشرین کی کانفرنس بلانا چاہتے ہیں تاکہ تمام حضرات اپنے اپنے اخبارات لا کر قوم کے سامنے ایک ڈھیر میں ڈالدیں کہ لیجئے، یہ آپ کی امانت تھی آپ کو واپس کی جا رہی ہے۔ اب یہ کاغذ کی ناؤ ہم سے نہیں چل سکتی۔ یا تو ٹائپ کو منظور کیجئے۔ اخباروں کو لاکھوں کی تعداد میں خریدیئے یا پھر ہمیں یہ دکان بند کر دینے کی اجازت دیجئے۔ ہم دق کے مریض کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا نہیں چاہتے ہم کب تک اس چکر میں پھنسے رہیں، دس پانچ ہزار کی تعداد میں چھاپ کر اور خریداروں اور اشتہاروں کی بھیک مانگ مانگ کر گزر اوقات کرتے رہیں۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ آپ پنت جی سے اُردو کو منظور کرائیے، لیکن ہم تو اسے چھوڑ رہے ہیں، اور اگر پنت جی اپنے سرکاری دفاتر میں اُردو کو رکھنا چاہیں تو رکھیں، لیکن اگر یہی صورت رہی تو پبلک میں اُردو کا نام و نشان نہ رہیگا۔

اگر خدا نخواستہ، کسی روزانہ اُردو اخبار کی سرکولیشن ایک لاکھ ہو جائے تو اس کے نکالنے کا انتظام اس قدر محال ہو جائے کہ شاید اس کے مہتمم کو اس حادثہ کے بعد خودکشی کرنی پڑے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان سے اُردو ختم ہو جائیگی۔ لیکن ہم ذرا اس سے اختلاف کر کے ہم سمجھتے ہیں کہ اُردو ختم ہو چکی ہے۔ ختم تو وہ چیز ہوتی ہے، جس کا وجود ہو، جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، وہ ختم کیا ہو گی۔؟

ہندوستان میں دو تین فلمی رسالوں کے سوا کوئی ایسا اُردو روزنامہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، یا ماہنامہ رسالہ موجود نہیں جس کی اشاعت بیس ہزار ہو۔ جو زبان ہندوستان کے چالیس کروڑ کی قومی زبان بننے کی دعویدار ہے، اس کے پاس بیس ہزار چھپنے والا ایک اخبار موجود نہیں اُردو زبان ہندوستان کی قومی زبان بننے کے لائق ہے، اس کا زندہ ثبوت اُردو کے بھوکے ننگے، فاقہ مست، اخبار نویس، ایڈیٹر، مضمون نگار، مفلس شاعر ہیں۔ اُردو کی پچیس سالہ پبلک تحریک ایک اخبار نہ پیدا کر سکی۔ اور اُردو کی ایک سو برس کی کوشش کے بعد بھی اُردو کا ایک پبلشنگ ہاؤس قائم نہ ہو سکا۔ آپ فرمائیں گے کہ ہندوستان میں اُردو کے سینکڑوں پبلشنگ ہاؤس موجود ہیں۔ لیکن معاف کیجئے گا ایک معمولی سا پریس قائم کرنے پر بھی ساڑھے چار لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ اُردو کے جو پبلشر ہیں، انھیں پبلشر کہنا اس لفظ کی توہین ہے۔ آج کل ایک اچھی کتاب پر پچیس ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔ پھر اگر اس کے پاس سو پچاس کتابوں کا بھی سیٹ موجود نہ ہو تو وہ پبلشر کیا؟

یہی حال روزانہ اخباروں کا بھی ہے۔ ہم ایک اور دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ ان اخباروں کو چھوڑ کر، جو ہندوؤں کی ملکیت ہیں، اُردو کا ایک روزنامہ موجود نہیں جس کی اشاعت دس ہزار ہو۔ ہندوؤں کے اُردو اخبارات کو ہم نے اس لئے شمار نہ کیا کہ شاید وہ بہت جلد اُردو کو ترک کر کے اپنے اخبارات ہندی میں جاری کرنے والے ہیں اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے والے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں اُردو کے بیشتر قیمتی روزنامے، سہ روزہ، اور ہفتہ وار اخباروں کی اشاعت پانچسو سے لیکر دو ہزار تک ہے۔ اس کے بعد معدودے چند اخبارات کی ساعت پانچ ہزار ہے، اور ملک کے ہندوستان میں دو چار ہی روزنامے یا سہ روزہ ایسے خوش نصیب ہیں جن کی اشاعت آٹھ نو ہزار کی ہو سکے۔ ہمارا اُردو ہائی … قدر ننگا … ناقابل توجہ ہے کہ اگر اُردو کے سارے اخبار بند کر دیئے جائیں تو کبھی کسی کا کوئی اثر نہ ہو سکے … عدم وجود برابر ہے۔ ہندوستان کی قومی زبان کہلانے والی اُردو کے تمام اخبارات اور رسالوں کا سرکولیشن ایک طرف، اور ہندی زبان کے ایک ماہنامہ رسالے کا سرکولیشن دوسری طرف دونوں برابر ہی ہونگے۔ ایک سال میں سارا اُردو پریس جس قدر کاغذ صرف کرتا ہے

اتنا کیا کہ گجراتی کا روزنامہ جنم بھومی صرف کرتا ہے۔ یہ ہے وہ سارا اُردو پریس جس سے مسلمان اپنی حفاظت کا کام لینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ پریس جو خود نان شبینہ کو محتاج ہو، وہ اپنی حفاظت تو کر نہیں سکتا، مسلمانوں کی کیا حفاظت کریگا۔ تعجب ہے جاکر وہ مسلمانوں کی حفاظت کا کام چیتھڑوں سے لیا جارہا ہے۔ اُردو اخباروں، جن میں روزنامہ، سہ روزہ، ہفتہ وار اور ماہنامہ سب ہی شامل ہیں، میں پچاس فیصدی ایسے ہیں جن کا کوئی دفتر نہیں، یعنی ان کا دفتر غریب خانہ ہی ہے۔ اکثر اردو اخباروں کے پاس چپراسی نہیں۔ یعنی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، منیجر، پروپرائیٹر، کلرک اور چپراسی، یہ تمام عہدے ایک ہی بزرگ کے سپرد ہیں۔ نوے فیصدی اردو اخباروں کے پاس ٹیلیفون نہیں ہے، اور اسی طرح نوے فیصدی کے پاس چھپائی کے لئے اپنی ایک مشین تک موجود نہیں۔ ہندستان کی سر زمین پر کوئی ایسا اُردو اخبار موجود نہیں جس کے بینک میں ایک لاکھ روپئے موجود ہوں۔ ہندی کا کوئی روزنامہ نکلتا ہے تو وہ ایک سال کا کاغذ اسٹاک اپنے پاس رکھ لیتا ہے تو نکلتا ہے یعنی یہ سارا کا سارا اُردو پریس اس قدر مفلوک الحال اور غریب ہے کہ وہ محض ایک جھونکے کا منتظر ہے اور اس زمانے میں ایسے جھونکے آتے ہی رہتے ہیں، کاغذ کی نایابی کے ایک جھونکے نے انھیں نیم جان کرکے چھوڑ دیا ہے۔ اور اب دوسرے جھونکے میں ان کا خاتمہ ہے۔ ہمیں تو ایسا نظر آرہا ہے کہ چند سال کے اندر اُردو کے تمام اخبارات بند ہوجائیں گے۔

کاغذ کی نایابی کا رونا رویا جاتا ہے۔ حالانکہ کاغذ بافراط ملتا ہے۔ بشرطیکہ یکشت دس ہزار کا براہ راست مِل سے خریدا جائے۔ الہ آباد کا ایک اُردو روزنامہ چھ ہزار کی اشاعت تک پہنچنے کے بعد بھی بند ہوگیا۔ کیونکہ ۵۰ء۴۰ روپئے ریم کے بجائے ۱۲ روپئے ریم کے حساب سے بلیک مارکیٹ سے نہ خرید سکا۔ چھ ہزار کاپیوں میں ۱۲ ریم صرف ہوتے ہیں یعنی اس بیچارے کو ۷ روپئے ریم کے حساب سے روزانہ ۸۴ روپئے زائد دینے پڑتے تھے یہ محض اس لئے کہ وہ دس ہزار روپئے کا یکشت کاغذ خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اسی طرح اس اخبار کا کوئی اپنا پریس نہ تھا، اور اسے ۱۲۰ روپئے روزانہ دوسرے پریس کو صرف چھپائی کے دینے پڑتے اور یہ محض اس لئے کہ وہ دس ہزار روپئے کی پرنٹنگ مشین نہ خرید سکتا تھا یعنی اگر اس اخبار کے پاس محض بیس ہزار روپئے ہوتے تو وہ روزانہ دو سو روپئے کی فضول خرچی سے بچ سکتا تھا غرضکہ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اخبار چھ ہزار کی اشاعت کے باوجود بند ہوگیا۔ ہم نے تو یہ کلیہ بنالیا ہے کہ اگر کوئی اُردو اخبار بہت زیادہ چھپنے لگے تو سمجھو کہ اس کی موت کے دن قریب آگئے! کیونکہ اس کی پشت پر سرمایہ یقیناً نہ ہوگا۔

جب کوئی صاحب اُردو کا اخبار نکالتے ہیں تو چند دنوں کے بعد انھیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس سے اُن کی روٹی نہیں چل سکتی، اس کے بعد وہ مقروض ہونے لگتے ہیں، لوگ رائے دیتے ہیں کہ پریس کرلو، پریس نفع کی چیز ہے، اور اس سے خسارہ پورا ہوجائیگا، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پریس سے بھی اُن کی روٹی نہیں چل سکتی، اس کے بعد لوگ کتب خانہ اور بک ڈپو کھولنے کی رائے دیتے ہیں، اور جب اس پر بھی پیٹ نہیں بھرتا تو سرمہ، منجن اور تیل بیچنے لگتے ہیں، اور ان کا اشتہار اپنے اخبار میں دیتے ہیں، اور آخر میں جنسی دواؤں پر تان ٹوٹتی ہے لیکن اس کے بعد ان کا اخبار (جنسی دواؤں کے زور پر) کسی حد تک اپنے پیر پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ یعنی غریب اُردو کے ایڈیٹر کو زندہ رہنے کے لئے کتنے دھندے کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اس بیکس و مفلس زبان کی خدمت کو ترک کرکے کوئی پان تمباکو، یا بیڑی کی دکان، یا چُنگی کے دفتر میں ملازمت بھی کرلے، تو وہ بیوی اور اپنے بال بچوں کو دو وقت عزت آبرو کے ساتھ دال روٹی کھلا سکتا ہے۔

آپ یہ سوال کریں گے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسکا جواب صرف ایک ہی ہے یعنی قوم کی ناقدردانی۔ مسلمان قوم اپنے اخبارات و رسائل کی سرپرستی نہیں کرتی۔ کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والا مسلم طبقہ، جن میں وکیل، بیرسٹر، تاجر، زمیندار، ڈاکٹر اور متوسط طبقے کے دوسرے افراد شامل ہیں انگریزی اخبارات پڑھنے کا عادی ہے۔ روزانہ ترقی اور انگریزی اخبارات خریدتے ہیں۔ لیکن یہی وہ طبقہ ہے، جس کا دل اردو کیلئے پھٹا جارہا ہے، جو پلیٹ فارموں سے اُردو کی حمایت کرتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ آپ پڑھتے ہیں انگریزی اخبار، اور چاہتے ہیں اُردو کی ترقی۔ یہ ہوتے ہیں ہمارے لیڈر اور کیبنٹ۔ ان دنوں سب سے زیادہ ماتم، سیمینار اور مذمت

کے ڈر سے سرکاری مسلم ملازمین کا طبقہ بے حس نظر آتا ہے۔ لیکن اُردو اخبارات و رسائل کی خریداری کو وہ گناہ سمجھتا ہے، اور اس کے پیسے انگریزی کی سرپرستی کے لئے وقف ہیں۔ جہاں تک مسلم امرا، اور بڑے بڑے تاجروں کا تعلق ہے انھیں اپنے مشاغل ہی سے فرصت نہیں اور وہ اُردو اخباروں کے نام بھی نہیں جانتے اگر شاذ و نادر کبھی وہ اُردو اخبار کا چندہ ادا کرتے ہیں تو خیرات سمجھ کر۔ یہ طبقہ اُردو اخباروں کی کمپنیوں کے حصے نہیں خریدتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اُردو کے درد قولنج میں یہ طبقہ بھی بُری طرح گرفتار ہے۔ اور اپنے کو اُردو کا علمبردار اور سرپرست کہتا ہے۔ ایک مسلمان تاجر سے راقم الحروف نے دریافت کیا کہ آپ نئی زندگی ملاحظہ فرماتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہم نے پھر پوچھا کہ کوئی اُردو اخبار یا رسالہ آپ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اخبار و رسائل پڑھنے کی فرصت کہاں۔ بس کسی طرح صبح کو انگریزی کا ڈیلی اخبار پڑھ لیا کرتا ہوں۔ ہم نے جواب دیا کہ جب آپ جیسے متمول شخص کو اُردو کا اخبار پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی تو آخر ہم ہی لوگوں کے پاس کافی فرصت ہے، اور گھر سے فاضل ہیں کہ ہم اخبار نکالا کریں ہم بھی اسے بند کر دیں۔ اردو ہماری ذاتی وراثت تو ہے نہیں جس کے لئے ہم پریشان ہوتے پھریں اگر قوم ہی کو اس کی فکر نہیں تو ہم ہی کیوں اس کی فکر میں دُبلے ہوں۔

لیکن مندرجہ بالا تمام مسلم طبقے، پنڈت گووند ولبھ پنت اور جواہر لال سے اُردو کا مقابلہ کرنے میں سب سے آگے آگے ہیں اور سردار پٹیل کو اُردو کا دشمن بتلاتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اُردو کے بدترین دشمن ہیں، اور اُردو کی خود ایسی حالت ہے کہ وہ خود بخود ختم ہو جائیگی کسی کو اس کے ساتھ دشمنی کرنیکی ضرورت نہیں۔ اور اگر اس میں کوئی جان ہوتی تو دنیا کی کوئی حکومت اسے ختم نہ کر سکتی تھی۔ اگر ہمارے پاس دس لاکھ چھپنے والا روزنامہ اخبار ہوتا تو ہم پنڈت گووند ولبھ پنت کو اپنی روٹری مشین پر پچاس ہزار فی گھنٹے کی رفتار سے چھپنے والا اخبار دکھلا دیتے، اور لکھنؤ کے گورنمنٹ سکریٹریٹ جیسا اس کا دفتر اور اسٹاف دکھلا دیتے، اور کہتے آپ اُردو کو سرکاری نہ رکھئے ہمیں اس کی پروا نہیں لیکن آپ اس زبان کو ختم نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے اخبارات دس دس لاکھ کی تعداد میں چھپتے ہوں اُسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ لیکن یو۔ پی کے دارالخلافے، جہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی ۵۵۸ لاکھ ہے اور جہاں اُردو کے آدھے درجن روزنامے نکلتے ہیں، ان روزناموں میں کسی کا دفتر یا پریس ایسا نہیں، جسے کسی شریف آدمی کو دکھلایا جا سکے۔ قومی آواز کی بات الگ ہے، کیونکہ اس کی پشت پر نیشنل ہیرالڈ کا ہاتھ ہے۔ غور کرنیکی بات ہے کہ یو۔ پی کے ۵۸ لاکھ مسلمان کے پاس ایک اُردو اخبار بھی ایسا نہیں جس کی ایک لاکھ کی اشاعت ہو اور دعویٰ یہ ہے کہ انکی زبان اُردو ہے اور اس صوبے کی زبان اُردو ہونی چاہیئے۔

بہر حال دیگر مسلمانوں کا وہی تھوڑا پڑھا لکھا چھوٹے موٹے کام اور پیشے کرنیوالا غریب طبقہ ہے جس پر سارے اُردو اخبارات و رسائل کی کفالت کا بار ہے اور یہ طبقہ بھی اب کچھ تو پاکستان کے سبب تباہی، دوسرے عام کساد بازاری کے سبب اس سرپرستی کا بوجھ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتا۔ اصل میں یہی وہ طبقہ ہے جو سچے معنوں میں اُردو کا حامی اور علمبردار ہے۔

گاندھی جی کی شہادت کے بعد ان کے اخبار ہریجن سیوک کے کارکنوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُردو ہریجن سیوک بند کر دیا جائے اس پر ان بیچاروں پر سارے ہندستان سے لے دے ہوئی کہ یہ دیکھو ان کا تعصب کہ گاندھی جی کی آنکھیں بند ہوتے ہی انھوں نے اُردو دشمنی شروع کر دی اور گاندھی جی کے مشن کو وہ بھول گئے۔ لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جب سے اُردو ہریجن سیوک نکلا اس کے اب تک دو سو خریدار بھی نہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اسے کس لئے چھپوایا جائے بنئے کے ہاں بیچنے کے لئے ؟ مولانا سید عزیز حسن بقائی مُدیر حقیقت نے ہریجن سیوک کے کارکنوں پر فرقہ پروری کا الزام لگایا اور پھر انھیں یہ صلاح دی کہ اگر اُردو ہریجن اپنے پیروں پر کھڑا نہیں تو گجراتی ہریجن سے اس کا خسارہ پورا کر دیا جائے، لیکن اسے ضرور نکالا جائے۔ لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ اُردو میں اگر خود طاقت نہیں تو اب اسے بھیک پر نہ زندہ رکھئے اور اگر اس کے دو سو بھی خریدار نہیں تو اُردو ہریجن کو بند ہی کر دینا چاہئے۔ جس چیز کی مانگ نہیں، وہ چیز کیوں مارکیٹ

میں لائی جائے۔

اُردو اخباروں کی "معذرت" کے تو آپ کافی عادی ہو چکے ہوں گے۔ آج کاتب نہیں آیا، کل پریس کا پرزہ ٹوٹ گیا، پرسوں کاغذ نہ مل سکا، اگلے دن ایڈیٹر صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ یا ان کا بچہ بیمار ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ موجودہ اُردو پریس اس طرح زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا اور وہ چند دنوں کا مہمان ہے۔ اُردو پریس کا حال آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب آیئے اُردو پبلشنگ کا جائزہ لیں۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، ہندستان میں اُردو کا ایک بھی بڑا پبلشنگ ہاؤس موجود نہیں اگر آپ نے کوئی اعلےٰ درجے کی کتاب تصنیف کی ہو تو آپ کو یہ سوچنا پڑیگا کہ کہاں چھپوائی جائے۔ اس ملک کے اندر صحت اور نفاست کے ساتھ اُردو کتابیں چھپنے کا بڑے پیمانہ پر کوئی بھی انتظام نہیں ہے اور نہ مصنفوں کو کوئی معاوضہ دینے کو تیار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس ملک میں یہ قاعدہ رائج ہے کہ مصنفین اپنی کتابیں خود چھپوا لیتے ہیں لیکن دو تین سال میں بھی ہزار دو ہزار کا ایڈیشن نہیں نکال سکتے۔ اور بالآخر مصنف صاحب اپنی تصنیف کو بنئے کے ہاں ردّی میں بیچ ڈالتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے کوئی اُردو کتاب چھاپنے سے کان پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح اس مصنف کی صلاحیتوں سے اُردو ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ منشی پریم چند ابتدا میں اُردو ہی کے لکھنے والے تھے اور یہ دعوےٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک اُردو میں اتنا بڑا ناول نویس پیدا نہ ہو سکا، لیکن ان کی کتابوں کا ایک ہزار کا ایڈیشن بیچنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ بالآخر انھوں نے اس مقاطعہ کے ساتھ اُردو کے قلم کو توڑ کر پھینک دیا اور ہندی کا قلم اٹھا لیا کہ —— میں بنئے کے ہاں اپنے ناولوں کو ردّی کے بھاؤ بیچنے کے لئے تیار نہیں۔ غرضکہ اُردو اس طرح اتنے بڑے ادیب سے محروم ہو گئی۔ یہی حال پنڈت سدرشن کا ہوا۔ اُردو کے کتنے ہی ہونہار ادیب ستارے کی طرح اُفق پر ٹمٹماتے ہیں، اور پھر ہمیشہ کے لئے بجھ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی بہترین ادبے … … نے اُردو والوں کی ناقدری کے ہاتھوں ایک دو کتابوں کے بعد لکھنا ہی بند کر دیا۔

بس اُردو والوں میں تعریفیں خوب ملتی ہیں، اور خطابات بہت سستے داموں مل جاتے ہیں۔ مصور غم، مصور فطرت، ترجمان حقیقت، سحبان الہند، شاعر انقلاب، شاعر انسانیت وغیرہ خطابات مل جاتے ہیں، خواہ ان مصور غم یا شاعر انقلاب صاحب کی کتاب کی ہزار جلدیں بھی نہ بکیں۔ قوم ہمیں یہ رشوت دیکر دھوکہ دینا چاہتی ہے۔ راقم الحروف نے ایک کتاب … … شائع کی تھی۔ اس کی بڑی تعریفیں ہوئیں، یہاں تک کہ بڑے بڑے لیڈروں نے کہا کہ ہم اس کتاب کو ہر وقت اپنے … رکھتے ہیں۔ لیکن آج دو سال بعد بھی اس کے ایک ہزار کے ایڈیشن کے اب تک کچھ نسخے پڑے ہوئے ہیں اور اس کام میں ہمیں کافی نقصان رہا۔ ملکی سیاسیات پر متعدد کتابیں شائع کرنیکا ہم نے پروگرام بنایا تھا، لیکن اس کے بعد اب ہمت نہیں پڑتی۔ اسی طرح رسالہ نئی زندگی کی بڑی تعریفیں ہوتی ہیں کہ اُردو کا یہ سب سے بہتر رسالہ ہے لیکن اس رسالے کی اشاعت پانچ ہزار بھی نہیں۔ اگر اتنی تعریف نہ کی جاتی تو ہم زیادہ مطمئن ہوتے۔ اُردو کے … رسالہ کے پاس دس ہزار روپے کا غذ خریدنے کے لئے نہیں۔ — پھر یہ رسالہ بہترین کیسے ہے۔ ہمیں ان چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کیجئے۔ ہم ان تعریفوں سے مطمئن نہیں ہو سکتے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوم کی نظروں میں ہماری کیا وقعت ہے۔ آپ یو۔پی میں سرکاری زبان نہ بنائے جانے پر واویلا کرتے ہیں، لیکن اس سے بڑا حادثہ یہ ہوا کہ رسالہ ساقی بند ہو گیا۔ جو دہلی کی ٹکسالی اُردو کا مرقع تھا، اور جس نے اُردو میں سب سے زیادہ تخلیقی ادب پیدا کیا۔ اُردو صحافت کے غالباً سب سے بڑے محسن نیاز فتحپوری کے رسالہ نگار کا کیا حال ہے، معارف کا کیا ہے، اور ان جیسے بہترین … … فائدہ اٹھاتی ہے۔ ان کی کیا اشاعت ہے … … بات ہے کہ … … تمام صحیفہ نگار اپنے جرائد کو بند کر دینے کا فیصلہ کر لیں … … اُردو کے لئے … رہے۔

بہرحال بات یہ تھی کہ … … … … …

وان یا مصنف کی کتاب نہ ملے گی۔ بڑے بڑے شعراء جیسے میرؔ، انشاؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، مصحفیؔ، داغؔ، اکبرؔ (الہ آبادی) وغیرہ کے دیوان آپ کو ہیں بھی نہ ملیں گے حتیٰ کہ غالبؔ کا دیوان مشکل سے ملتا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے نہایت خوبصورت دیوانِ غالبؔ، برلن میں چھپوایا تھا، ن اسکا اسٹاک اب تک پڑا ہوا ہے آپ کہیں گے یہ تو پرانے شعراء ہیں، لیکن حضرت جگرؔ، جن کے کلام پر مشاعروں میں چھتیں اڑادی تی ہیں، ان کا دیوان نایاب تھا، اور اب مکتبہ جامعہ نے چھاپا ہے۔ لیکن وہ بھی ایک سال میں ہزاروں کی تعداد میں بھی نہ بک سکا۔ اقبالؔ ہ اکثر کتابیں آؤٹ آف اسٹاک ہیں۔ آغا حشر کے ڈرامے آپ کو کہیں کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ عبدالحلیم شررؔ کے ناول نہیں ملتے۔ اسی ح شبلیؔ کی تمام عمدہ تصانیف آؤٹ آف اسٹاک ہیں۔ ہندوستان کے کسی شہر میں اردو کی کتابوں کی کوئی دوکان نہیں۔ اگر آپ کو اردو کتابیں خریدنی ہوں تو لاہور، دہلی، لکھنؤ یا بمبئی جاکر خریدیئے یا پارسل سے منگایئے۔ لیکن اب لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں بھی کتابیں ں ملتیں۔ الہ آباد کوئی چھوٹا شہر نہیں، یہاں ہر چیز کی دوکان موجود ہے، سوائے اردو کتابوں کے۔ ظاہر ہے دوکان ہوتی ہے، صرف چیزوں کی جن کی پبلک کو ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کتابوں کی کس کو ضرورت ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اردو مٹائی جارہی ہے۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہ کہ اردو ہے کہاں؟ ہاں ہدایت نامہ خاوند یا کوک شاستر آپ ڈھونڈھیں تو ہر جگہ مل جائیگی۔ اردو کی کوئی اچھی کتاب دوبارہ شائع نے کی کسی پبلشر کی ہمت ہے، اس کا ہمیں یقین نہیں جو کچھ کتابیں چھپتی تھیں وہ لاہور یا دہلی میں، لیکن یہ دونوں مرکز اب تباہ گئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں تو کیوں پڑھائیں جبکہ اردو کی تمام اچھی کتابیں نایاب ہ؟ کیا ہدایت نامہ خاوند یا کوک شاستر پڑھنے کے لئے؟ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان کے سکولوں، پوسٹ، اسٹامپوں، یلوے اسٹیشنوں پر اردو زبان کا بورڈ لگا ہو، یا عدالت، اور تھانوں کی رپورٹیں اردو میں لکھی جائیں، یا یوپی گورنمنٹ کے سرکاری غذات اردو میں آیا کریں۔ ہم ان چیزوں کے پڑھنے کے لئے اپنے بچوں کو کبھی اردو نہ پڑھائیں گے۔ بلکہ اس لئے پڑھائیں گے کہ وہ غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور جگرؔ کا کلام پڑھے، شبلی نعمانی، ابوالکلام، سلیمان ندوی، اور خواجہ حسن نظامی کی نثر سے محظوظ ہو، پریم چند کے ولوں سے دلچسپی لے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے کلام سے محظوظ ہو یعنی مختصر یہ ہے کہ اردو میں جو خزانہ بھرا پڑا ہے، اس سے مالا مال ہو۔ اگر نگریزی میں شکسپیئر، بائرن، ملٹن، گولڈ اسمتھ، ٹیگور، وغیرہ نہ ہوتے تو ہم محض ریلوے ٹکٹوں کے لئے یا کچہریوں کی مثل پڑھنے کو انگریزی نہ پڑھتے۔

کسی اردو کے دشمن ہی نے اردو کی ترقی کی یہ تحریک چلائی ہوگی کہ اردو کے لٹریچر کو تو دفن کردیا جائے، لیکن سرکاری عدالتوں میں، ریلوے اسٹیشنوں پر اردو کا بورڈ لگانے پر زور دیا جائے، اور اس کے لئے ایجی ٹیشن کیا جائے۔ اردو کی تحریک میں جو لوگ لگے ہیں، یعنی وکلاء، ڈاکٹر، روساء، بڑے بڑے سرکاری ملازمت والے ان سے آپ سوال کریں کہ اردو کے کسی بڑے مصنف یا شاعر کی تصنیف آپ نے پڑھی ہے ب نئی میں میگا ایک بھی تصنیف نہ ہوتی۔ لوگ کس طرح اردو پر فریفتہ ہوگئے ہیں محض کچھ بورڈوں کے سمجھنے، یا اسٹیشنوں کے بورڈ پڑھ سکیں؟ تان کے کتنے باحیثیت لوگ ہیں جن کے پاس اردو کی کتابوں کی ایک لائبریری موجود ہے؟ لہٰذا یہ معقول سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب آپ کے بنگلوں میں موجود نہیں تو سرکاری دفاتر میں کس لئے رکھی جائے۔

اردو کا سب سے بڑا شاعر بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں گانے فلمی گانے لکھ کر چار پانچسو روپے ماہوار پر اپنا پیٹ پال رہا ہے۔ اگر فلم کمپنیاں ہ انڈیا ریڈیو نہ ہوتا تو شاید اردو کے شاعر اور ادیب سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوتے۔ مقصد یہ ہے کہ اردو کے کروڑوں ہمدردوں کا اور اردو کو قومی زبان بنانے والوں کا گروہ اپنے شعراء، ادیبوں اور اخبار نویسوں کی کفالت بھی نہیں کرسکتا۔ ہم ہندوستان کے کسی ولیس یا ادیب کو نہیں جانتے جو اپنے بچے کو بھی اردو کا ادیب بنانے کا خیال رکھتا ہو۔ کیونکہ وہ خود جس مصیبت میں مبتلا ہے، اس میں پاندان کو کیوں مبتلا کرے۔ بالفاظ دیگر اردو کا ادب اور صحافت بس موجودہ نسل ہی تک محدود ہے اسی طرح ہم اردو کے کسی کاتب جانتے جو اپنے بچے کو بھی کاتب بنا رہا ہو یعنی یہ کتابت بھی اسی نسل تک ہے۔

اردو زبان ہندستان میں باقی رہیگی یا نہیں؟ اس کا اندازہ آپ اردو کے شاعروں، ادیبوں، ایڈیٹروں، کاتبوں، ناشروں، کتب فروشوں اور ایجنٹوں اور پریس والوں کی حالت دیکھ کر لگائیں۔ آپ ان چہروں پر نظر ڈالیں، اور ان کے مدقوق سراپا، ستے ہوئے منہ، پھٹے ہوئے کپڑے، متفکر اور مضمحل چہرے، اور سر دن پر قرض کی گٹھریاں مت لگائیں۔ یہ تمام چہرے پکار پکار کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اردو زبان باقی نہیں رہ سکتی۔ اور اردو کے یہ آخری وارث ہیں، جو اس کے جنازے کو اپنے کندھوں پر لئے جا رہے ہیں۔

ایک بات عرض کرنی بھول گئے۔ اردو پریس بھی یہ آخری پریس ہے اور اس کے انتقال پر ملال کے بعد آپ کو دوسرا پریس نہ مل سکے گا۔ موجودہ لیتھو پرنٹنگ مشین جس پر ہم اردو چھاپتے ہیں، یہ اردو چھاپنے کی مشین ہی نہیں بلکہ یہ نقشے چھاپنے کے لئے بنی ہے لیکن ہم اس پر اردو چھاپتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ٹینس کھیلنے کے جوتے فوج کے سپاہیوں کو پہنا دیئے جائیں۔ بہرحال یورپ اور امریکہ میں یہ مشین Condemn ہو چکی ہے، اور اب وہ آفسٹ مشینوں پر نقشے چھاپتے ہیں چنانچہ لیتھو مشینوں کی ڈھلائی بند کر دی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہندستان کے اندر جتنے پریس موجود ہیں، ان کے ختم ہو جانے کے بعد اردو بھی ختم ہو جائیگی۔ کیونکہ آفسٹ کی بڑی مشین مع اپنے لوازمات کے ایک لاکھ روپے میں آتی ہے۔ کتنے اردو پریس ہیں جن کے پاس یہ مشین خریدنے کی صلاحیت ہے؟ اتنا ہی نہیں اس کی خوراک بہم پہونچانا بھی مشکل ہے، کیونکہ یہ گھنٹے میں پانچ ہزار چھاپتی ہے۔ اردو میں اتنا کام کہاں ہے۔ ہاں صرف دہلی یا لاہور جیسے شہروں میں اس قسم کی ایک یا دو مشینوں کی خوراک مہیا ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی اردو کا کٹر دشمن ہو تو پچاس لاکھ کی قربانی کر کے وہ اس وقت ہندستان سے اردو کا نام و نشان مٹا سکتا ہے یعنی اردو کتابوں کا سارا بچا کھچا اسٹاک خرید کر جلا ڈالے، تمام لیتھو پریس خرید کر انھیں توڑ ڈالے، اور جس طرح ڈالمیا اور برلا نے ہندستان کے کئی انگریزی اخبارات خرید لئے ہیں۔ اسی طرح اردو کے اخباروں کو بھی خرید کر اور بند کر دے۔

حال میں ایک خبر پڑھی تھی کہ ... جنگ حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی (علیگڑھ) اپنی گرانبہا تصنیف چھپوا رہے ہیں اور جس طرح کرسچین پادری انجیل تقسیم کرتے ہیں، یہ قیمتی تصنیف بھی لوگوں کو مفت روانہ کی جائیگی یعنی شیروانی صاحب جیسے جید عالم اور بلند پایہ مصنف کو بھی غالباً یہ ڈر ہے کہ ان کی کتاب دوسروں کی طرح کوئی خرید نہ سکے گا یعنی اب یہ وقت اردو کا آخری وقت معلوم ہوتا ہے۔

افسوس کہ ابھی کہنے کے لئے بہت سی باتیں ہیں، لیکن صفحات کی گنجائش ختم ہو گئی۔ انشاءاللہ پھر کسی فرصت میں اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

آپ نہایت سنجیدگی سے یہ سوال کریں گے کہ یہ تو تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور آخر اس کا علاج کیا ہے؟ ہندستان میں اردو کی واقعی ترقی کے لئے ... پروگرام علیحدہ پیش کریں گے لیکن ابھی چند باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

(۱) اردو کی ترقی کے لئے ایک بہت بڑا فنڈ مہیا کیا جائے، جو فی الحال دس کروڑ سے کم نہ ہو۔ اس رقم کی مدد سے فوراً اردو کا عمدہ ٹائپ ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ اردو کی چھپائی کے لئے اپنی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یورپ یا امریکہ میں نئے ڈیزائن کی دیدہ زیب سستی بھی مشین ڈھلوائی جائے۔ اردو کا ٹائپ رائٹر بنوایا جائے۔ اردو کا لینو ٹائپ بنوایا جائے۔ اردو کا ٹیلی پرنٹر ڈھلوایا جائے جس پر روزانہ اخباروں کو خبریں مل سکیں وغیرہ وغیرہ۔

(۲) ہر شخص جو اردو جانتا ہے، اور ہمارے خیال میں ایسے لوگوں کی تعداد ہندیونین میں کم از کم پچاس لاکھ ہوگی۔ ہر ... ایک کتاب خریدنے کا اصول بنا لے۔

(۳) ہر اردو داں، ایک روزنامہ (یا سہ روزہ)، ایک ہفتہ وار اور دو ماہوار رسالے خریدنا اپنا فرض منصبی سمجھے۔ اگر ایک شخص یہ بار نہ برداشت کر سکتا ہو تو دو آدمی مل کر خریدیں۔

(۴) کوئی کتاب، اخبار یا رسالہ عاریتاً لیکر اور بغیر قیمت ادا کئے ہوئے پڑھنا اخلاقی جرم قرار دیا جائے۔

(باقی صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ ہو)

آل احمد سرور

ریڈیائی ڈرامے

ڈراما زندگی کی کشمکش، اُس کے اتار چڑھاؤ، اس میں عمل اور ردِ عمل کی لہروں کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعری اُن خوابوں کی کہانی ہے جو انسان دیکھتا ہے۔ ڈراما خوابوں اور حقیقتوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کی تصویر ناول اور افسانے میں بھی ہوتی ہے مگر ڈراما زندگی کی تخلیق کرتا ہے۔ ناول لکھنا آسان ہے کیونکہ اُس کے فارم میں بڑی لچک اور گنجائش ہے۔ ڈراما لکھنا مشکل ہے، کیونکہ ڈرامے کا فن بڑا ضبط و نظم اور ٹیکنک سے گہری واقفیت چاہتا ہے۔ اردو میں اچھے ناول کم لکھے گئے ہیں مگر اچھے ڈرامے اور بھی کم ہیں۔ ناول کے لئے بقول ایک مغربی نقاد کے ایک "فلسفیانہ رجحان" کی ضرورت ہے، ڈراما کے فروغ کے لئے حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت کی۔ ہمارے ادب میں ڈرامے کی عمر بہت کم ہے۔ اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں ادب کو ادب بننے میں بہت دیر لگی۔ اُسے مذہب و اخلاق، فلسفہ و تصوف کی غلامی زیادہ کرنی پڑی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو کے ادیبوں نے اسلامی تہذیب کی پاسداری میں ڈرامے کو زیادہ منہ نہ لگایا اور سٹیج یا تھیٹر کو ایک بازاری چیز سمجھا۔ ڈرامے کو اپنے ابتدائی دور میں مذہب اور مذہبی روایات سے بہت مدد ملی ہے۔ اردو میں یہ بھی نہ ہوا۔ بیسویں صدی نے جہاں ادب کی ہر صنف کو آزادی عطا کی ہے وہاں ڈرامے کے ذریعے سے زندگی کے مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔ ہمارے شروع کے ناول قصے، اچھے وعظ ہیں اتنے اچھے قصے نہیں۔ اسی طرح شروع کے ڈرامے نیم ڈرامائی قصے یا منظوم ادب پارے ہیں۔ انھیں کسوٹی پر کسے جانے کے مواقع نہیں ملے، وہ کھیلے نہیں گئے۔ ایک اچھا تھیٹر وجود میں آنے سے پہلے فلم اور ریڈیو نے اپنے مطالبے شروع کر دیئے اور ڈرامائی صلاحیتیں اس سیلاب میں بہہ گئیں۔

کلیم الدین نے ایک جگہ کہا تھا کہ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ تنقید کے متعلق تو یہ صحیح نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اردو میں اچھے ڈرامے بہت ہی کم ہیں۔ حشر کے ڈرامے، شاعرانہ کارنامے ہیں بلکہ خطیبانہ شاعری اور رنگین مکالموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انارکلی اور پردۂ غفلت میں ادبیت زیادہ ہے، ڈراما کم۔ نئی پود نے فن کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر مجید، نور الٰہی، محمد عمر، اپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو اور انصار ناصری وغیرہ نے بعض اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے اس دور میں اُسی وجہ سے مقبول ہیں جس وجہ سے مختصر افسانے۔ فلم اور ریڈیو کی مقبولیت نے کئی اچھے ادیبوں کو ڈرامے کی طرف مائل کیا ہے۔ کرشن چندر اور بیدی، امتیاز علی تاج اور شوکت تھانوی نے ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے ہیں۔ ریڈیو پر ہلکی پھلکی چیزیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان ادیبوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس شیرینی میں کچھ تلخی بھی ملائی ہے۔

ریڈیو کا معیار زیادہ تسلی بخش نہیں ہوتا۔ ریڈیو کے کرتا دھرتا، چند اشخاص کو چھوڑ کر علمی و ادبی معیاروں سے زیادہ سرکاری یا ذاتی معیاروں کے قائل ہوتے ہیں اور ریڈیو سننے والوں کے مذاق کی تربیت کرنے کے بجائے اُن کی بد مذاقی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے یہاں اتنی پابندیاں ہوتی ہیں کہ بڑا ادب وجود میں نہیں آ سکتا۔ "خونِ دل" کو "مالِ تجارت" بنانا آسان بھی تو نہیں۔ پھر بھی ریڈیو کے طفیل میں لکھنے والوں کی ایک نئی پود ہمارے سامنے آئی ہے۔ ریڈیو غذا تو زیادہ نہیں ہاں شہرت دے سکتا ہے۔ اُس کی بعض ضروریات ہیں، اُس کے فن کے کچھ تقاضے ہیں۔ جس میں جبر و اختیار، مجبوری و محرومی کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں، وہاں آنکھوں کا گزر نہیں، صرف کانوں کی [illegible]۔ ہم آپ دیکھ نہیں سکتے۔ صرف سن سکتے ہیں۔ اس لئے ریڈیو ڈرامے میں ہر چیز اس طرح بیان کرنی چاہئے کہ وہ سنی جا سکے۔ ہر واقعہ کو ہنگامہ بنانا ضروری نہیں، نہ واقعات کے بیان میں

خارجی چیزوں سے خواہ مخواہ مدد لینے کی ضرورت ہے، الفاظ کی مدد سے، مکالے کے اسلوب سے، ذہنی تصویریں بنائی جا سکتی ہیں لوئی میک نیلین جو انگریزی کا مشہور شاعر اور ڈراما نویس ہے اور جس نے بی بی سی کے لئے متعدد ڈرامے لکھے ہیں، اس پر زور دیتا ہے کہ ریڈیو ڈرامے میں سارا کھیل "تعمیر" کا ہوتا ہے۔ ہر ڈراما کسی نہ کسی کشمکش پر قائم ہوتا ہے۔ بلکہ برنارڈ شا تو یہاں تک کہتا ہے کہ ڈراما کشمکش یا تصادم کا دوسرا نام ہے۔ اگلے ڈرامہ نویس یہ کہتے تھے کہ کشمکش ہے تو اس کا انجام بھی ہونا چاہئے اور انجام ایسا ہونا چاہئے کہ ہر ایک کو نظر آ جائے یا پھر ہر ایک کو پسند آئے، ہر ایک کی نظر کی خاطر لوگ کرداروں کو مسخ کرنے سے نہ چوکتے تھے، ہر ایک کی پسند کی خاطر، شادی یا محبت کی کامیابی، یا راہ نجات ضروری تھی۔ بیسویں صدی میں لوگ اتنی آسانی سے فریب میں نہیں آتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر کشمکش کا انجام نہیں ہوتا جس طرح زندگی کا کوئی انجام نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ہار جیت، محبت و نفرت، سفید و سیاہ، رنج و راحت الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ایسے ملے ہوئے ہیں کہ ان میں بعض اوقات تمیز مشکل ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک دور کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی آج کی ایک بات سچ بھی ہوتی ہے اور جھوٹ بھی پھر محبت کی لاتعداد قسمیں ہیں اور ان میں سے ایک نفرت بھی ہے۔ محبت آسمانی جذبہ سہی۔ مگر اس کی جڑیں بعض ٹھوس مادی چیزوں پر قائم ہیں۔ انسان آسمانوں میں پرواز کرنا چاہتا ہے مگر زمین اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ آسمان پر اڑ نہیں سکتا تو اس کی طرف دیکھ تو سکتا ہے اور وہ اپنے ان خوابوں سے زندگی کو کچھ رنگین تو بنا سکتا ہے۔

ہمارے ڈرا نویس اب ان حقائق کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ وہ فرائڈ اور مارکس سے واقف ہیں۔ فرائڈ اور مارکس سے واقف ہونا مفید ہے مگر اس سے زیادہ ڈرامے نویس کے لئے زندگی اور اس کی گوناگوں تصویروں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کے ڈراموں میں جان، زندگی کے مشاہدے اور تجربے کی گہرائی سے ہی آتی ہے

میں نے انتصار نیوتنوی کے ڈراموں کو دلچسپی اور لطف سے سنا ہے۔ مجھے ان کو سن کر یہ احساس ہوا کہ انتصار سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں ایک سنجیدہ شعور ملتا ہے۔ ان کے ڈرامے وعظ یا پروپگنڈا نہیں ہیں، زندگی کے مرقعے ہیں، انھوں نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے۔ غالباً اُن کی تصنیفی زندگی پانچ چھ سال سے زائد نہیں اس عرصہ میں انھوں نے ——— ناول، ڈرامے، افسانے سبھی لکھے ہیں اور اُن کے کئی مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔

ان کے نشر شدہ ڈراموں میں سے "لڑائی کے بعد" ——— مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ جنگ ملکوں اور قوموں کی زندگی میں کایا پلٹ کر دیتی ہے۔ گھروں میں عورتوں اور مردوں کے لئے نئے نئے سوالات کھڑے کرتی ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں لڑائی ہمیشہ جاری رہیگی۔ لڑائی کے بعد وہ اپنی عزت نفس کھو بیٹھتے ہیں اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ بعضوں کی بصارت جاتی رہتی ہے مگر بصیرت بڑھ جاتی ہے۔ عورت ایثار کر سکتی ہے، مگر ایثار کر کے خوش رہنا اس کے لئے آسان نہیں۔ نوجوان لڑکیاں جو نہ ایثار کی قائل ہیں نہ صبر کی۔ مگر جو پہلو میں جذبات رکھتی ہیں، بعض اوقات گھریلو زندگی سے اکتا جاتی ہیں اور شرافت، ایثار اور خدمت سے بھی ——— "لڑائی کے بعد" ——— ایسے ہی تانے بانوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں واقعات تیزی سے کروٹ لیتے ہیں اور انجام تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ کردار نگاری میں واقعیت اور زندگی ہے۔ مکالموں میں فطری انداز ہے، مکالے صرف باتیں نہیں ہیں بلکہ اور بہت کچھ ہیں۔

——— "مزاجوں کی دنیا" ——— میں دو پہلو سامنے آتے ہیں خشکی اور کیچڑ۔ دردانہ اور احمر میں عہد و پیمان ہوا تھا کہ جب دنیا ان کی محبت کو انگیز نہیں سکتی تو وہ زہر کھا لیں گے۔ احمر زہر کھا لیتا ہے۔ دردانہ بھی چاہتی ہے کہ ایسا کرے، مگر ڈر جاتی ہے۔ زندگی اس کی بچی کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتی ہے۔ "کیچڑ" میں۔ یہی چیز ایک دوسری صورت میں سامنے آتی ہے ———

——— "بدنام کالونی" ——— جو ادب لطیف میں شائع ہو چکا ہے برنارڈ شا کے ایک مشہور ڈرامے ———

— تا بانان کے نیچے — Mrs Warrens Profession سے متاثر معلوم ہوتا ہے — اور — "باندی" — ہماری معاشرت کے بعض جانے پہچانے پہلوؤں کے متعلق ہیں۔

انتصار نے کہیں وعظ نہیں کہا۔ اُنھوں نے لیڈری بالکل نہیں کی۔ اُنھوں نے لمبی لمبی تقریریں بھی نہیں لکھیں اُنھوں نے فن کی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اُن کے مکالموں میں کہیں کہیں زبان کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ مگر بول چال میں ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اُن کے ڈرامے دلچسپی اور لطف سے سنے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اچھے اسلوب کی جو خوبی ہے وہ اچھے ڈرامے کی بھی ہے۔ دونوں میں پڑھنے والے کو خاموش طور پر ہر چیز قبول کرنی چاہئے۔ پڑھنے والا یہ نہیں چاہتا کہ اُسے اُنگلی پکڑ کر چلایا جائے۔ وہ ذہنی رفاقت پسند کرتا ہے۔ ان ڈراموں میں ذہنی رفاقت کا کافی سامان موجود ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔

(بقیہ اردو کا مستقبل)

(۵) شادی کے موقع پر لڑکیوں کو جس طرح بہت ساری فضول چیزیں جہیز میں دی جاتی ہیں، اسی طرح حسب لیاقت دس بیس سو، دو سو، ہزار دو ہزار روپے کی کتابیں بھی لازمی طور پر دی جائیں۔

(۶) تمام اُردو اخبارات و رسائل لمیٹڈ کمپنیوں کی شکل میں منتقل ہو جائیں اور ان میں جن اخبار اور رسائل کو قوم مفید سمجھے ان کے حصے خرید کر، پانچ پانچ، دس دس لاکھ روپئے، ان کے پیچھے جمع کر دے۔

(۷) پچاس پچاس لاکھ کے سرمائے سے چار پانچ مقامات پر (یعنی دہلی، لکھنؤ، بمبئی، کلکتہ اور حیدرآباد) اُردو کی بڑے بڑے پبلشنگ ہاؤس قائم کر دیئے جائیں۔

(۸) باٹا کے جوتوں کی طرح ہر ضلع کے صدر مقام پر سارے ہندوستان میں اُردو کتابوں کی ایک ہزار دوکانیں اور اسٹال کھول دیئے جائیں، اور ایک بڑی لمیٹڈ کمپنی یہ فرض اپنے ذمہ لے۔ یہ دوکانیں اُردو کے اخبار و رسائل کا بھی اہم مرکز ہوں۔

غرضکہ اس طرح قوم کی سرپرستی حاصل ہونے کے بعد اُردو کے بڑے بڑے اخبارات نکل آئیں گے اور جو غیر مفید جرائد ہوں گے وہ آپ ہی آپ مر جائیں گے۔ یہی لاکھ دو لاکھ کی اشاعت رکھنے والے — اخبارات و رسائل اردو کو بھی زندہ رکھ سکیں گے اُردو شعراء اور مصنفوں کی کتابوں کو ایک ایک لاکھ کے ایڈیشن نکل سکیں گے اور گویا اُردو ادب کی نشاۃ ثانیہ ہو جائیگی۔ اُردو کا اخبار نویس، مصنف، پریس، کاتب، کتب فروش اور ایجنٹ سبھی آسودہ حال اور خوش حال ہو جائیں گے اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں گے۔ نئے نئے مصنف میدان میں آئیں گے اور اُردو زبان کو مالا مال کر دیں گے۔ ہندوستان کے اخبار نویسوں اور ادیبوں کا معیار بھی یورپ اور امریکہ کے اخبار نویسوں کا سا ہو جائیگا۔

غرضکہ اس طرح اردو زبان کو ایک نئی زندگی مل جائیگی اور اس وقت آپ کو یہ شکایت پیدا نہ ہوگی کہ پنت جی نے اُردو کو یو۔پی کی سرکاری زبان تسلیم کیا۔ اُردو اس اسٹیج پر پہونچ جائیگی تو وہ جھک مار کر مانیں گے اور اگر نہ مانیں گے تو بھی کوئی خاص فرق نہ ہوگا۔

آپ یہ کہیں گے کہ مسلمان غریب قوم ہے۔ اس کے پاس پیسے کہاں؟ لیکن یہ چیز غلط ہے۔ مسٹر جناح کو دینے کے لئے کہاں سے دو کرور روپئے آ گئے تھے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غریب قوم ہے، تو ظاہر ہے، غریب قوم کی زبان اور لٹریچر تو زندہ نہیں رہ سکتا، تو پھر اسے مرنے دیجئے۔

کام ہے دولت سے یہ چرخ کہن چلتا نہیں　　(اقبال)

(نئی زندگی)

اس بار

نیا ادب

ہندستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا ماہنامہ نیا ادب نئے انتظامات کے ساتھ سردار جعفری، کرشن چندر، اور احمد عباس کی ادارت میں تقریباً ایک سال کے بعد دوبارہ شائع ہوا ہے، جس کا پہلا شمارہ پیش نظر ہے۔ اب نیا ادب اور اس کے ادارہ پر اہم ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں۔ کیونکہ اردو کانفرنس لکھنؤ کے فیصلہ کے مطابق نیا ادب ترقی پسند تحریک کے سرکاری پرچہ کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔ پہلے شمارے میں تحریک کے صحیح خدوخال پر "حرف آغاز" میں بڑی جرأت اور بیباکی سے روشنی ڈال دی گئی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ——— "ہماری تحریک میں نہ تو فرقہ پرستوں کی جگہ ہے۔ نہ موقع پرستوں کی اور نہ ابہام پرستوں کی۔ ترقی پسندی ایک نظریہ، ایک عقیدہ اور ایک باعمل فلسفہ ہے۔ یہ کوئی لیبل نہیں کہ جس کا جی چاہا اُس نے اپنے سینے پر ٹانک لیا یا اپنی کتاب پر لگا لیا تھا ———

اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ——— "یہ ہماری تحریک کی ایک بہت بڑی کمزوری رہی ہے کہ اس نے گذشتہ پندرہ سولہ سال میں صرف شاعری اور افسانہ نگاری کو فروغ دیا ہے۔ فلسفہ۔ سائنس۔ تاریخ۔ تنقید اور دوسرے علمی اور نظریاتی ادب کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے ———"

ان حقائق اور ان اعترافات کے بعد نیا ادب واضح پروگرام اور ٹھوس اور تعمیری تخلیقات کو لیکر سامنے آیا ہے۔ آج نیا ادب کو دیکھکر ہمیں کتنی خوشی ہے اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ——— اب ہم بجا طور پر اپنی تحریک میں مرکزیت پیدا کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ بشرطیکہ ادارہ پوری سرگرمی اور تندہی سے "نیا ادب" کو پابندی شائع کرتا رہے۔

اس شمارہ میں سردار جعفری۔ ممتاز حسین۔ اسرار الحق مجاز۔ نیاز حیدر۔ معین احسن جذبی۔ کرشن چندر۔ احتشام حسین حامد عزیز مدنی۔ مجروح سلطانپوری وغیرہ کے بلند پایہ مضامین نظم ونثر شامل ہیں۔ ہم افکار کے قارئین سے پر زور سفارش کریں گے کہ وہ ہمارا ادب کی ہر ممکن امداد فرمائیں۔ خود سرپرستی کریں دوسروں کو سرپرستی کے لئے آمادہ کریں اور اس طرح اردو زبان و ادب کو ترقی دینے اور اُسے آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

سرورق دلکش۔ بہترین کتابت و طباعت۔ صفحات ۸۰۔ قیمت ۱۲ / (بارہ آنے)

ملنے کا پتہ:۔ کتب پبلشرز لمیٹیڈ۔ ریگل بلڈنگ۔ اپالو بندر۔ بمبئی ملا

نقوش

ملک کے دو مشہور ترقی پسند فنکاروں ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کا مخلصانہ ادبی اشتراک نقوش کے ہر ہر صفحہ پر ایک ابدی صداقت بن کر مرقع چغتائی سے زیادہ تابناک، زیادہ روشن اور زیادہ گہرا ابھرا ہے۔ یہ وہ نقوش ہیں جن میں زندہ اور صحتمند قدروں کا لافانی سرمایہ شاعر اور ادیب کی تخلیقی صلاحیتوں کو حیات جاوید بخش رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے نئے اور پرانے رسالے نقوش کو دیکھکر بے اختیار چونک پڑے ہیں۔ اگر ادب ساحری ہے تو نقوش کا ہر نقش بہترین کاغذ، لاجواب کتابت و طباعت، کشش انگیز ترتیب و تدوین، اور مضامین نظم ونثر کے تعمیری رجحانات کا ایک ایسا مابہ الامتیاز مکمل نامہ ہے جو اردو زبان و ادب کے روشن مستقبل کو ظاہر کر رہا ہے۔ اس وقت تک نقوش کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس پرچہ کی ادبی عظمت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔ ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کی غیر معمولی صلاحیتیں نقوش کے ہر نقش کو بلند سے بلند تر صورت میں پیش کر رہی ہیں۔ ہم انکی اس ادبی پیشکش کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سفید چکنا کاغذ۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت۔ صفحات ۸۰۔ ملنے کا پتہ ادارہ فروغ اردو لاہور۔ قیمت عمر (ایک روپیہ)

صداقت

ملک کے مشہور طنز نگار غلام احمد فرقت کی ادارت میں ہفتہ وار صداقت لکھنؤ سے بپابندی شائع ہو رہا ہے۔ نظام بمبئی کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد کوئی ایسا ہفتہ وار پرچہ ہندوستان میں نہیں رہ گیا تھا جو بیک وقت ادب، سیاست، تہذیب و تمدن کی قدروں کو اجاگر کرتا۔ صداقت نے اس کمی کو نہ صرف پورا کیا ہے بلکہ معیاری مضامین نظم و نثر پیش کر کے اپنا ایک جداگانہ اور منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ صداقت کو ملک کے مشہور و ممتاز فنکاروں کا تعاون حاصل ہے، جن میں احتشام حسین، عبادت بریلوی، فراق گورکھپوری، علی عباس حسینی، مجتبیٰ احمد، ہاشم قدوائی، شمیم کرہانی اور ولی کمال خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سیاسی، ادبی اور علمی مضامین کے علاوہ بچوں اور عورتوں کا صفحہ بھی صداقت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والے صداقت کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی فرمائیں۔

صفحات تقریباً ۲۰ - قیمت ۴ر - سالانہ بارہ روپے
ملنے کا پتہ :- ۵۲۰ اے - جگت نرائن روڈ - لکھنؤ۔

فرض

(آزادی نمبر) یہ ایک نیا ہفت روزہ ہے جو ظفر احمد کی ادارت میں حال ہی میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اور جس نے ۱۵ اگست کے تاریخی موقع پر آزادی نمبر شائع کیا ہے جو اس وقت پیش نظر ہے۔ اس نمبر کی سب سے نمایاں اور چونکا دینے والی خصوصیت یہ ہے کہ جہازی سائز کے ۵۰ صفحات دو رنگوں میں حسین و دلکش آرٹ کے نمونوں پر شائع کئے گئے ہیں اور اس کی قیمت عام نمبروں کی طرح صرف ۴ر (چار آنے) رکھی گئی ہے۔ چار آنے میں آرٹ پیپر پر جاذب نظر سرورق اور ایک صفحہ پر قائد اعظم، جمال الدین افغانی؟! اور ڈاکٹر اقبال اور اندرونی چار صفحات پر مزید تصاویر اس پر متضاد ہیں۔ جہاں تک مضامین نظم و نثر کا تعلق ہے۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ادارۂ فرض نے تنوع کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اتنا سستا، اتنا جاذب نظر اور ادب، سیاست، فلم اور بچوں کے موضوعات پر متعدد افادی مضامین سے آراستہ اتنا مکمل پرچہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ ہاں استقلال (جو مغربی پنجاب کی حکومت کا نفیس مگر انتہائی ارزاں پرچہ ہے اور جس نے "سرکاری ادب" کا امتیازی درجہ حاصل کر لیا ہے) ضرور فرض کی اس "جرأت رندانہ" کو بنظر پسندیدگی نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ دو رنگی چھپائی نفیس کاغذ، متعدد تصاویر اور صرف ۴ر قیمت رکھنے والا ملک کا صرف یہی ایک پرچہ تسلیم کیا گیا تھا۔

بہر حال سرکاری ادب کے مقابلہ میں عوامی ادب ہی زندہ رہ سکے گا۔ اس لئے فرض کا یہ نمبر ہر آئینہ اس قابل ہے کہ ادب نواز حضرات اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ قیمت ۴ر - صفحات ۵۰ - زر سالانہ ۱۰ر
ملنے کا پتہ :- منیجر ہفت روزہ فرض - ۱۲ - نیلا گنبد - لاہور

نیا دور

رچپال سنگھ اس عوامی ہفت روزہ کے مدیر ہیں جو آجکل جیل میں ہیں۔ نیا زمانہ کی طرح کی نیا دور بھی محنت کشوں اور مظلوموں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ کانگریس حکومت کی عوام کش پالیسی پر سخت نکتہ چینی کے باعث نیا دور سے ایک ہزار کی ضمانت بھی طلب کی جا چکی ہے۔ ملک کی عوامی تحریکات پر نیا دور میں ہر ہفتہ نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اڈیٹوریل، مزدور کی ڈائری، کمیونسٹ تحریک دوسرے ملکوں میں مزدوروں کی دنیا وغیرہ اس پرچہ کی مستقل سرخیاں ہیں۔ آج کی عوامی جدّ و جہد اور موجودہ حکومت کے طریق کار کا اندازہ لگانے کے لئے نیا زمانہ کو چھوڑ کر نیا دور کے علاوہ اس وقت کوئی ایسا پرچہ نہیں جو کروڑوں ننگے، بھوکے اور افلاس کے مارے انسانوں کی بھلائی کے لئے کام کر رہا ہو۔

صفحات ۱۶ - قیمت ۲ر - ملنے کا پتہ :- دفتر نیا دور - اردو بازار - دہلی۔

"ش - ع"